صنم و حرم

شکیل بدایونی

بی ، اے (علیگ)

مکتبہ جدید لاہور

قیمت دو روپے چار آنے

فہرست

انتساب

بنام

عم معظم حضرت مولانا ضیاء القادری البدایونی

(وارد حال۔ کراچی)

جن کے آغوش تربیت نے

میری خوابیدہ صلاحیت شعری کو بیدار کیا

شکیل۔ بدایونی

مقدمہ

فراق گورکھپوری

شکیلؔ بدایونی کے متعدد حلقے ہیں اور متعدد حیثیتیں۔ آج کل وہ سب سے زیادہ زیادہ ایک فلمی شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ لیکن خود ان کے نزدیک اب بھی ان کی سنجیدہ شاعری ہی گراں مایہ باقی رہتی ہے اس کا بہت کچھ ثبوت اس مجموعہ کی اشاعت سے فراہم ہو جاتا ہے۔ فلم میں اپنی ایک حد تک قابلِ رشک کامیابی کے بعد بھی وہ شاعری اور غزل کے میدان سے روپوش ہونے پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے اور ان کے ہم کو یہ کہنے کا حق بالکل نہیں رہا کہ وہ اپنی پرانی شاعری کی پنشن ہی پہ صبر کر چکے ہیں رہ گئی یہ بات کہ آپ ایک قاری کی حیثیت سے ان کی نئی زندگی کے کس پہلو کو سب سے زیادہ اہم سمجھیں گے۔ اس کا دارومدار کچھ آپ کے ذوق پر بھی ہے اور کچھ شکیل صاحب کے کلام پر جس کو بہتر تو یہی تھا کہ کسی تعارف اور اس لئے تعصب کے بغیر ہی اپنے تاثرات کے ماتحت براہِ راست پڑھتے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ آج کل بقول شخصے محبوب کی تمنا کرنے تک کی لوگوں کو فرصت نہیں۔ بھلا کسی شاعر کو سنجیدگی سے پڑھنے اور پرکھنے اور کسی حد تک قابلِ اعتماد رائے قائم کرنے کی زحمت کون اٹھائے گا۔

دہ بھی اردو شاعری کے خطرناک حد تک محدود قارئین میں، مجبوراً شاعر کو کسی سہارے کی تلاش کرنی پڑتی ہے جس طرح شکیل صاحب نے مجھے سامنے کر دیا ہے۔ لیکن سہارے سے یہ مفہوم آپ ہرگز نہ نکالیں کہ اس کے بل پر ایک گمنام شاعر اپنے آپ کو روشناس کرانے کی فکر کرتا ہے۔ شکیل پر تو خیر گمنامی کا کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر یہ بدگمانی ان لوگوں کے سلسلے میں بھی درست نہیں ہے۔ جن کی شہرت ان کی شخصیت کی طرح سکڑی سمٹی ہوئی رہتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ قیاس بھی حقیقت سے کچھ بہت قریب نہیں ہے۔ کہ شاعر اپنے مقدمہ نگار کو ایک "سند" کے طور پر سامنے رکھ دیتا ہے اور اس وسیلہ سے بھی اپنے قاری پر کچھ رعب یا ناجائز اثر ڈالنا چاہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مقدمہ نگار سہارا تو ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کے لئے نہیں۔ شاعر تو مقدمہ نگار کی کمک محض اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اسے عام قارئین کی (جن کے لئے اس نے شعر کہے ہیں) دقتیں اور دشواریاں پیش نظر ہوتی ہیں اور جو سہولت وہ انھیں خود نہیں فراہم کر سکتا۔ وہ مقدمہ نگار کے ذریعہ سے مہیا کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس قسم کے مقدمے عام طور پر لوگوں کے لئے ایک سہارا ہی نہیں ایک افیم کا درجہ رکھتے ہیں کہ وہ زیادہ سوچ بچار کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر بنی بنائی ہوئی رائے اور تنقید کو تقریباً جوں کا توں تسلیم کر لیں اور مطمئن ہو جائیں کہ انھوں نے شاعر کو سمجھ لیا۔ لیکن سمجھدار کے لئے یہی تنقید ایک چیلنج بھی ہے اول تو اس لئے بھی کہ ایک مقدمہ نگار کبھی بھی ایک غیر فرمائشی نقاد کی طرح بے لاگ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اس وجہ سے بھی کہ ایک جاندار ذہن ہر خیال اپنا مخالف خیال خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔

شاعر کو اپنی نمائندگی کے لئے ایک دوسری شخصیت کی تلاش اس لئے بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ ہر شاعر کا تنقیدی شعور غالبؔ یا حالیؔ کی طرح زیادہ بیدار نہیں ہوتا۔ اور وہ پورے یقین سے اپنے ہی کلام پر خود ہی قلم اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتا۔ البتہ اگر اسے بہت ہی وزنی یا بہت ہی انوکھی بات کہنی ہے۔ جسے امانتاً بھی کسی مقدمہ نگار کے حوالے نہیں کر سکتا۔ تو پھر وہ اپنی نمائندگی خود کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسی وزنی باتیں روز نہیں کہی جایا کرتیں۔

تو پھر میں آپ سے شکیل صاحب کے بارے میں بالخصوص اس مجموعہ کے بارے میں کیا کہوں؟ یہ کہ یہ بہت اچھی شاعری ہے، بہت بلند، بہت عظیم شاعری ہے؟ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں ایک بندھی ٹکی ہوئی قطعی قسم کی بھاری رائے آپ کے اوپر دے مارنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ اور نہ ہی آپ کو اتنا تہی دماغ سمجھتا ہوں کہ اگر میں کچھ سمتوں کی طرف اشارہ کر کے چپ ہو جاؤں۔ تو آپ اپنی رائے خود قائم کرنے سے معذور سمجھے لوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح میں آپ کے پرکھنے میں اپنی بضاعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ مدد کروں گا۔ (اگر آپ کو اس کی ضرورت ہو) اس لئے میں یہی راستہ اختیار کر سکتا ہوں۔

اس مجموعہ کو سرسری طور سے پڑھتے ہوئے بھی ایسے اشعار اکثر مل جاتے ہیں۔ جن پر ہم کو تامل کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لہجے پر ایک نئی آواز کا گمان ہوتا ہے۔ جو بعض اوقات ہمارے اندر فکر و جذبات کی عجیب نیم آشنا سی دنیا کو بیدار کرنے لگتی ہے ان کا ایک بہ ظاہر معمولی سا شعر ہے۔

سعیٔ تشریحِ آرزو کی قسم
محرمِ آرزو نہ تم ہو نہ ہم

جس کو غزل کی عام روانی کے بہاؤ میں شاید ہم پڑھ کر آگے نکل جائیں تو بھی یہ ہمارے شعور میں ایک چٹکی لے لیتا ہے جو غالباً تھوڑی دیر کے بعد ہم کو لوٹ کر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دوسرے مصرعہ کے "ہو نہ ہم" میں "ہ" کا ھوتی جھٹکا لگتا ہے اس کے باوجود یا غالباً اسی کی بدولت ہمارے روائتی خیر میں بلبلے سے اٹھنے لگتے ہیں بہت سی تہیں کھلتی ہیں اور نکات روشن ہونے لگتے ہیں اور خیال آتا ہے کہ کتنی سچی اور کتنی چبھتی ہوئی بات کہی گئی ہے۔ جسے سب محسوس کرتے ہیں۔ اور کہنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی اور جسے کتنی صفائی اور بے باکی سے کہا گیا ہے۔ دور جدید کی عشقیہ شاعری میں بھی اگرچہ واقعیت نگاری کی اہمیت برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن جدید شعرا میں سے ہر شخص حب "حبیب اور محبوب" کی اپنی مخصوص اور منفرد اکائی کو لیتا ہے۔ تو بڑے یقین و اعتماد سے اسے گہرے سے گہرے خلوص اور ایک الہامی بصیرت کا سرچشمہ قرار دے دیتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے دوسرے مرکزی حقائق کی طرح عشق میں بھی چاہے ہم اسے کتنی ہی عظیم رفعتوں پر کیوں نہ دیکھیں۔ ایک ناہمواری ضرور ہوتی ہے تصنع کی کھوٹ، کدورت کی گرد اور کم بینی کی دھند کچھ نہ کچھ ضرور چھائی رہتی ہے جسے شاعر نے یہاں بہت سہج سے اور بلا کسی فن کارانہ طمطراق کے بے نقاب کر دیا ہے۔

لیکن پھر بھی اس شعر میں حسن و عشق کی ماہیت میں جو تبدیلی اور تلچھٹ موجود ہے۔ اس کو ظاہر کرنے کے لئے انھیں اپنے مرتبہ سے گرایا نہیں گیا ہے۔ روائتی انکسار سے مغلوب ہو کر اپنی یا اپنے منسوب کی ہیچدانی کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں "ہم" اور "تم" سے محض شاعر اور اس کا محبوب مراد نہیں ہے۔ جس کا کچھ نہ کچھ اندازہ جمع کے صیغے سے بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں تو یہ کہا جا رہا ہے کہ ہیں جو اپنے جنون و گمشدگی

میں بھی آرزو کے راز سربستہ سے اپنے آپ کو اس قدر قریب محسوس کرتا ہوں......

...... میں بھی سچ پوچھو تو تم سے کچھ زیادہ باخبر نہیں ہوں۔ اگرچہ میری بصیرت اور وارفتگی کاری کے لئے اس سے زیادہ خراج تحسین اور کیا ہوگا۔ کہ تشریح آرزو کی ہر سعی خام پر بھی تم کو میری گرمیٔ شوق ضمیری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ وہ خاموشی سے اور دل ہی دل کیوں نہ ہو۔ یہ اپنی کم آگاہی اور کم مایئگی کا احساس نہیں۔ بلکہ ایک ایک لمحہ بیداری کی گرفت ہے۔ جس نے گویا ایک ہی صاعقہ میں حسن وعشق کی تعمیر کے تمام اجزا کو بے نقاب کردیا۔ ان کی ناپیدا کنار وسعتوں ہی کو نہیں بلکہ فاصلوں کی دھند میں چھپے ہوئے حدود کے نقوش بھی ابھار دیئے۔

ایک اور شعر ہے۔

کہاں تک ختم رہتا درمیاں پر دل کا افسانہ :: بالآخر درمیاں سے ابتدا کرنیکا وقت آیا

یہاں اشارہ یہ نہیں ہے کہ محبوب کا سماعت سے گریز اب آمادگی میں تبدیل ہوگیا۔ بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ ابھی تک ماحول ایسا نہیں تھا کہ زخم وجراحت کی باتیں کیجاتیں اور لوگ (محض محبوب ہی نہیں) انھیں اس ہمدردی، اور اک اور سمجھ کے ساتھ سنتے جس کی توقع ہو سکتی اور جو کسی بھی مرہم ودرماں کا نعم البدل بن سکتی ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ وہ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جن کی بدولت ماحول میں عشق کی گہرائی اور گیرائی کو انگیز کرنے کے لیے حالات سازگار ہوتے جاتے ہیں۔ اور جنہوں نے اس داستان کو از سر نو ابتدا کرنے کا نہیں۔ بلکہ ارتقا کی نئی منزلیں طے کرنے کا حوصلہ بخش دیا ہے۔

زہد وتقویٰ کے قائم کیے ہوئے بتوں کو توڑنے میں یوں تو اردو، شاعری کو ہمیشہ ہی سے بڑی دستگاہ حاصل رہی ہے۔ لیکن شکیل جب اس فرسودہ موضوع پر

قلم اٹھاتا ہے تو اس طرح کہتا ہے۔

موجِ انفاسِ زاہداں توبہ   بجھ نہ جائے کہیں چراغِ حرم

کس قدر شدید اور کتنا ذاتی احساس جھلک رہا ہے۔ اس شعر سے۔ زاہدوں پر گرجنے برسنے میں جوش بھی اپنی ایک مخصوص روایت قائم کر چکے ہیں جو فرسودہ مضامین کے اعادہ سے ہرگز تعبیر نہیں کیجا سکتی بلکہ ہمیشہ ذاتی شدت احساس کی ترجمان رہی ہے لیکن لہجہ میں اس قدر دھیرج اور پھر اتنا کرب اور خلوص ایسی خصوصیات ہیں۔ جو شکیل کو ممتاز کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ شکیل کے یہاں زاہد کوئی شخص نہیں ہے۔ بلکہ ایک طبقہ، ایک قوت، ایک اصول ہے جس کے مجموعی اثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس خمیر سے اظہار وحشت کیا گیا ہے جو تباہی تاریکی سے ہے اور جس سے تخریب بالکل غیرارادی طور پر پھیلتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ شکیل میں نظم کہنے کی اتنی ہی صلاحیت تھی۔ جتنی غزل کے کہنے کی۔ اور شروع میں ایک آدھ اچھی نظم کہی بھی تھی جو نہ معلوم کیوں اس مجموعہ میں شامل نہیں کی گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے ان صلاحیتوں کو جلا دینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی اور غزل تک اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ ان کی غزل پڑھنے سے یہ اثر ضرور پڑتا ہے کہ غزل گوئی ان کے لئے کوئی دقت طلب امر نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی نظم کی بہت سی آزمائشوں سے گذرنا آج کل کے اردو شاعر کے لئے فن کے مناسب اور پورے نشو و نما کی خاطر تقریباً ضروری اور ناگزیر بن گیا ہے۔ خاص طور سے ایک ایسے شاعر کے حق میں جو غزل میں کسی شدید جفاکشی اور عرق ریزی کے بغیر

ہی اس قدر بے تکلف اظہار پر قابو حاصل کرے۔

لیکن اب تو ہم کو شکیل کے کلام کا جائزہ اس دائرہ کے اندر ہی رہ کر لینا ہوگا۔ جو انہوں نے اپنے لیے کھینچ لیا ہے۔ اور ان حدود میں ہم ان سے جدید اور پیچیدہ مضامین نظم کرنے کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ نفسیاتی باریکیوں کی ترجمانی کا بار ان پر نہیں ڈال سکتے تاریخ اور سماج کی قوتوں کے ادراک اور ان کی ہمنوائی کی توقع بھی ان سے نہیں کر سکتے۔ اگر چہ ایک آدھ شعر ایسا مل بھی جائے۔

شکیل ان کشمکش کی ساعتوں میں ؛ غزل کیوں کر کہوں میں عاشقانہ

اس کو ان کے کمزور لمحوں کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ نہ کہ ایک مستقل رجحان کیونکہ وہ تو خود بھی بڑے اصرار سے کہتے ہیں۔

تفسیر دو عالم ہے شکیل۔ یہ تغزل ؛ میدان غزل چھوڑ کے ہم جا نہیں سکتے

اور یہاں تفسیر دو عالم میں جدید مباحث و نظریات شامل نہیں ہیں۔ بلکہ وہی "تغزل" کے مانوس نکات ہیں جن کے لیے غزل اب تک مخصوص رہی ہے۔ اور جن کی ہزاروں تشریحوں کے بعد بھی ان میں اپنے تجربہ اور فکر کی بضاعت کے مطابق ایک نیا پن دریافت کیا جا سکتا ہے۔ شکیل کے متقبل اور دیرپا تاثرات تو غزل کے جادۂ نو سے بھی الگ ہیں۔ چنانچہ وہ مغرب زدہ فنکاروں سے اسی لیے برہم ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ انھیں اسی بزم کا رکن معلوم ہوتا ہے اور اس کی "نکتہ بازی" اور دماغ کو تھکا دینے والی پیچیدہ گتھیاں ان کے صفائی پسند مزاج کو بالکل نہیں بھاتیں اور وہ سبھی کو مشورہ دیتے ہیں کہ

مغرب زدہ ادیب کی دنیا سے بچ کے چل

اور خود اس سے متوجہ ہو کر کسی قدر مجروح پندار کے لہجہ میں چیلنج بھی پیش کرتے ہیں۔

تشکیل اس دور کے مغرب زدہ فنکار سے کہدو ؎ زمانہ کو پلٹ دے گا یہی رنگ کلام اپنا

اسی طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ "نقاد" بھی ان کے نزدیک مغرب زدہ ادیب سے کچھ مختلف جنس نہیں ہے۔ اس پر اگرچہ وہ عتاب تو نہیں لیکن اس کے مطالبات بھی شکیل کے فن اور اس کے مطمح نظر سے بہت بعید ہیں۔ چنانچہ انہیں "نقاد" کی طرف سے کچھ اتنی بدگمانیاں ہیں۔ جن کے اظہار سے مصلحت اور ادبی سیاست کے تقاضے بھی انہیں باز نہیں رکھ سکتے۔ وہ اپنی پہلی ہی نظم میں نقاد کے تخریبی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ اشارہ نا اہل شعراء کے سلسلے میں ہے۔ جن سے وہ خود ظاہر ہے کہ بالکل الگ اور ممتاز ہیں۔ لیکن جب وہ ایسے شعرا کے دیوان کے بارے میں کہتے ہیں۔

جس دن آئے گا تہ پنجۂ تنقید نگار

خود تنقید نگار کے بارے میں ان کا رویہ اور اس سے ایک چھپا ہوا خوف ان کے لہجے سے پھوٹ پڑتا ہے۔ "تنقید نگار کا قلم قصائی کی چھری کی طرح سفاک معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ تو خیر ان کی پہلی نظم تھی۔ لیکن یہ امر بہت معنی خیز ہے کہ پہلی غزل میں تنقید نگار کا ذکر آتا ہے اور تقریباً اسی لب و لہجہ میں اس غزل میں گویا اپنا ایک مثبت تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اور وہ بھی ایک دفاعی لہجہ پر ختم ہوتی ہے اور تنقید نگار کی سیاست کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس شد و مد سے نہیں جو "مغرب زدہ ادیب کے سلسلے میں نظر آیا تھا۔ کہتے ہیں۔

ہے ظلم شکیل اہل سیاست کا وگرنہ ؎ گنجائش تنقیص کہاں میری غزل میں

ظاہر ہے کہ یہاں "اہل سیاست" سے سردار پٹیل اور جے پرکاش نرائن نہیں، بلکہ ادبی سیاست کے افراد نقاد اور تبصرہ نگار ہی مراد ہیں۔ جن کے بارے میں شکیل کو نہ صرف ایک بے چینی رہتی ہے جو اندر ہی اندر انھیں ستاتی ہے۔ بلکہ وہ اس کی دلیلوں کو بھی سوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنے طریقہ پر ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ٹھیک اسی غزل میں انھوں نے کہا ہے۔

تعمیر کے پہلو بھی نہاں میری غزل میں
ملتا نہیں رجعت کا نشاں میری غزل میں

نقادوں کی اونچی دکان میں شکیل کو اپنے لئے پھیکے پکوان کے علاوہ اور کچھ نہیں مل سکا۔ اور بالآخر جب انھیں اپنی شاعری کی داد پانے بلکہ اس کے ٹھکانے سے سمجھے جانے کے لئے بھی اس حلقہ میں کوئی سازگار فضا نہیں ملتی تو وہ ذرا ناامید ہو کر کہتے ہیں

ہزار نقاد زندگی ہیں مگر کوئی نکتہ رس نہیں ہے۔

"نقاد زندگی" کی تقریباً اصطلاحی ترکیب استعمال کرکے وہ اس امر کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ کہ ان کا کن لوگوں اور کن اصولوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور اگر اس سلسلے میں اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہ جائے تو وہ "عوام" کے متعلق اپنے رویہ کی وضاحت کرکے اس تصویر کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ انھیں کم از کم یہ تو معلوم ہی ہے کہ "عوام" والی جنس بھی وہی ہے جس کا "مغرب زدہ فنکار" اور "نقاد" کے یہاں اکثر چرچا رہتا رہتا ہے۔ اور جس کو یہ لوگ سب سے زیادہ گراں قدر جنس سمجھتے ہیں۔ شکیل صاحب عوام کے "پست ذوق" کا تذکرہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں

ہیں اہلِ منزلِ منفرد، روشِ عوام سے کیا مجھے
جو نقوشِ خود رفتہ پا نہ ہو اسی رہگذر کی تلاش ہے

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شکیل نے اس ذیل میں جو کچھ بھی کہا ہے۔ کسی دل آزاری یا اشتعال انگیزی کی غرض سے نہیں بلکہ بڑی معصومیت سے کہا ہے۔ اس لئے اس پر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ یا آمادۂ پیکار ہو جانا بالکل نتیجہ خیز نہیں ہوگا یہ اس لئے بھی ہے کہ اس شاعری کو جو اس مجموعہ کی زینت ہے۔ ہم "فن برائے فن" کے نظریہ سے متاثر ہونے کی تہمت نہیں لگا سکتے اس کے لئے تو فن کی شعوری اور موثر شعریت کی کئی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ یہاں تو بالکل سیدھی سادھی اور صاف ستھری غزل گوئی ہے۔ جس میں حسب معمول اچھے شعر بھی نکلتے ہیں۔ برے بھی اور منجھولے بھی۔ اب اگر ہم زبردستی اس پر اور کوئی نظریہ مسلط کرنے کی کوشش کریں۔ تو اپنے اور شاعر دونوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔

اس لئے ایسے تمام موقعوں پر مناسب یہی ہوتا ہے کہ بحثوں سے بے تعلق ہو کر صرف اشعار کا لطف اٹھایا جائے۔ کیونکہ اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ ایک شعر کا مثبت ٹھوس وجود ہزار دلیلوں پر بھاری ہو جائے۔

اس مجموعہ کا ایک شعر ہے

کھل گیا تجزیۂ غم سے ہر اک راز حیات

زیست مبہم تھی اگر دل نہ پریشاں ہوتا

اور کتنا اچھا شعر ہے! اور اس کے بعد ہی غزل کے خالص کلاسیکی رنگ کا کتنا ستھرا شعر نکالا ہے۔

تو نے سوچا کبھی دامن کو بچانے والے — کچھ سکت ہاتھ میں ہوتی تو یہ داماں ہوتا

ایک بڑی مرصع غزل کے چند منتخب اشعار ہیں۔

ہر اک قطرہ خنجر، ہر اک بوند نشتر
یہ آنسو ہیں یا زندگی کا پسینہ
تلاطم سے زور آزما کر تو دیکھیں
بلا سے اگر ڈوب جائے سفینہ
چلو ان سے عرضِ وفا کر تو دیکھیں
وہ دادِ محبت نہ دیں گے یہی نہ
شفق جس کو سمجھے ہوئے ہیں نگاہیں
ہے فطرت کے ہاتھوں میں شرح آبگینہ

آخری شعر پر بے اختیار حضرت شکیل کے ذوق مصوری کی داد دینی پڑتی ہے
محبوب کی نظر سے اب تک نظریں تو الجھتی رہی ہیں۔ بالخصوص جری اور گستاخ
نظریں۔ لیکن نظر سے زبان کا اور وہ بھی مجبور و بے بس زبان کا "الجھنا" بالکل انوکھی
بات ہے۔ لیکن دیکھئے یہاں کس خوبصورتی سے نظم ہوئی ہے

کہاں تک اے دلِ مضطر فریبِ تابِ سکوت
الجھ پڑے گی نظر سے زباں کبھی نہ کبھی

جدید غزل میں اس موضوع پر اکثر طبع آزمائی ہوتی ہے۔ کہ مدت اسیری کے
طول اور انسداد زمانہ نے اکثر قفس سے ابھی ابھی چھوٹنے والے پرند کو اپنے آشیاں
تک سے کسی قدر بیگانہ بنا دیا ہے۔ لیکن شکیل اسی موضوع پر کہتے ہیں اور فرسودگی
کی چھینٹ بھی اپنے دامن پر نہیں پڑنے دیتے۔

جہاں کی نیرنگیوں سے یکسر بدل گئی آشیاں کی صورت
قفس سمجھتی ہیں جس کو نظریں وہ درحقیقت قفس نہیں ہے

نو آزاد پرند کی نفسیاتی کیفیت کا کتنا لطیف تجزیہ ہے کہ قفس کی طویل زندگی
اور صعوبتوں کی بدولت ہر شے پر جو نظروں کے سامنے آتی ہے۔ قفس کا گمان ہوتا ہے
یہاں تک کہ خود اپنے آشیاں پر بھی کتنا خاموش المیہ ہے۔ اور کس قدر دلدوز۔!

چمن کی آزادیاں موخر تصورِ آشیاں مقدم
غمِ اسیری ہے نامکمل اگر غمِ خار و خس نہیں ہے

کس قدر لطیف امتیاز پیش کیا گیا ہے۔ ذاتی خواہشات اور لذتوں میں یہ جذبہ ہے جو ایک جانب اکثر جذبہ حب وطن کو سنوار دیتا ہے - اور اپنی دھرتی سے سچا پریم سکھاتا ہے دوسری جانب یہ گل و لالہ کے ساتھ ساتھ خار و خس کی محبت بھی سکھاتا ہے خود نمائی اور خود آرائی ایک عام انسان کے لئے بھی کتنی معیوب خصوصیات سمجھی گئی ہیں۔ اور نہ کہ ایک محبوب پر مر مٹنے والے عاشق کے لئے جس کا وجود جس کا نفس نفس عبادت و پرستش کے لئے وقف ہے۔ لیکن اب دیکھیے :-

غرور بے نیازی، خود نمائی و خود آرائی
جو تجھ میں ہیں وہی انداز پیدا کر رہا ہوں میں

ایک چھوٹی سی غزل ہے جو پوری کی پوری بالکل استادانہ انداز میں کہی گئی ۔ پوری غزل تو طول کے خوف سے دہرائی نہیں جا سکتی۔ لیکن پھر بھی چند شعر بلا غور ہیں۔

ان سے امید رونمائی ہے — کیا نگاہوں کی موت آئی ہے؟
وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی — ہائے کس وقت نیند آئی ہے
میرے معبد نہیں ہیں دیر و حرم — احتیاطاً جبیں جھکائی ہے
گل فسردہ، چمن اداس شگیں — یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

اس شعر میں سے

نہ ساغر ہے نہ پیمانہ، نہ ساقی ہے نہ میخانہ

شکیلؔ اب چند اشکوں پر گذارا کر رہا ہوں میں

ضبط غم کے لئے آنسو پینے کا جو مرحلہ آتا ہے۔ اس سے کتنا عجیب و غریب فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

اور ان کا یہ شعر۔

مجھے آرزوئے ستم ہی تھی مگر اس نے درس وفا دیا
میں نثار بخشش حسن کے مرے ظرف سے بھی سوا دیا

تو بہت ہی مشہور ہے اور تبصرہ سے بے نیاز۔

اپنے مخصوص دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی شکیلؔ کی شاعری میں کچھ منزلیں آتی ہیں۔ کہ وہ بھرپور جوانیوں کی، ولولوں اور حوصلوں کی شاعری بن جاتی ہے۔ جس کا سراغ ہم کو محض اس قسم کے خوشگوار اشعار ہی میں نہیں ملتا۔

تلاطم سے زور آزما کر تو دیکھیں
بلا سے اگر ڈوب جائے سفینہ

یہاں شورشوں اور تلاطم سے مراد ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ قسم کی جنگ نہیں ہے۔ بلکہ ایک بے پرواہ مہم آزمائی ہے۔ خون کی گردشوں کا ایک حرارت ہے۔ اور ایک بھولا پن ہے۔ بلکہ اس شبابی میلان کا اثر ان کے فن پر کچھ اس طرح پڑا ہے کہ اس نے ان کی ہیئت پر بھی بڑے گہرے نقوش چھوڑ دیئے ہیں۔ غزل جیسی ارتکھی ہوئی۔ تامل اور پس و پیش میں کھوئی صنف میں انہوں نے جوش کی نظموں سے آنکھ ملانے والی رواں دواں زمینیں نکالی ہیں۔ اور ان میں جو اشعار کہے ہیں۔ وہ پھر

بھی خالص غزل کے اشعار رہتے ہیں۔

زندگی لے کے ارباب جہاں چل دیئے
راہ سونی ہوئی کارواں چل دیئے

ذرا یہ حوصلہ شکن موضوع ملاحظہ ہو اور اس کے باوجود یہ گنگھروں کا تال وسم!

یہ عزم بال و پر لئے چمن میں پھر رہا ہے کون
نہ خوف برق و باد ہے نہ فکر سوز آشیاں
جنوں پہ ہو کے طعنہ زن خرد نے کچھ کہا مگر
میں اپنی منزلوں کی سمت چلدیا رواں دواں

آخری شعر کسی ایسی شخصیت کی تصویر نہیں کھینچتا۔ جس کا جنون ایک کہنہ مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بلکہ اس سے ہرن کی طرح کلیلیں بھرنے والے ایک ایسے لا ابالی آوارہ گرد کا خیال آتا ہے۔ جس کو جوانی ایڑ دے رہی ہے اور جس کا جنون بھی اس پر ایک ہلکے نشے کا سرور بن کر طاری ہے۔

شکیل نے اساتذہ کے مخصوص اور پسندیدہ موضوعات پر خود اپنے زاویۂ نظر کو واضح کرنے میں قطعاً تکلف نہیں برتا ہے۔ اقبال کا شعر ہے۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

لیکن اسی مضمون کو جب شکیل باندھتے ہیں تو یوں باندھتے ہیں۔

تھے منتشر ازل میں جو ذرات کوئے دوست
انسان بن کے عالم امکاں میں آ گئے

غالب کے اس اشعار کے بعد:۔

بہت دلوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

کسی کو اس کے قریب بھی جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اور یہ اپنی جگہ حرف آخر بن کر رہ گیا۔ لیکن شکیل نے اس جھجک کو توڑا ہے اور کہا ہے۔

یوں دیکھتے ہیں جیسے ادھر دیکھتے نہیں!
اس لطف بے طلب کی نزاکت نہ پوچھئے

ایسے تجربوں کے پیش نظر اگر بعض اصحاب کلاسیکی اور معیاری حیثیت رکھنے والے اشعار کے موضوعات پر مشق سخن کو نامناسب سمجھیں تو ان کی مخالفت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی میں غزل کے اس قسم کے بالکل منفرد موضوعات کے بھی اعادہ کے حق میں ہوں۔ کیونکہ اس کی بدولت تقابل مطالعہ میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

آخر میں شکیل صاحب کو ایک مشورہ بھی دینا چاہوں گا۔ اور یہ اختیار بھی کہ وہ اس پر اعتنا کریں یا نہ کریں۔ یہ مشورہ غالباً اس لئے اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ کہ شکیل اپنی زندگی اور شاعری کے اس موڑ پر آ گئے ہیں جہاں ان کے لئے خطرات زیادہ ہیں اور سنبھالنے والے عناصر بہت کم فلم میں کامیابی کے بعد پڑھنے لکھنے سنجیدہ شاعری کے ذوق کو قائم رکھنے۔ ٹھوس اور وزنی باتوں میں دلچسپی قائم رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ تپا مارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہر شخص آسانی سے نہیں کر پاتا۔

ان کی شاعری کی وسعت یوں ہی ناکافی تھی۔ لیکن اگر انہوں نے بہت زیادہ اور بہت مخلصانہ کوشش نہ کیں تو ان کی یہ پونجی بہت دن تک نہ کام آسکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے۔ کہ شکیلؔ ایسا ہونے نہیں دیں گے۔

تقریظ

(از ساحر لدھیانوی)

جگر اور فراق کے بعد آنے والی پود میں شکیل بدایونی ہندوستان کے واحد شاعر ہیں۔ جنہوں نے اپنے فن کے لئے غزل کا میدان منتخب کیا ہے۔ اور اس قدیم مگر جامع اور دل کش صنف سخن کو جس میں ہمارے ماضی کا بہترین ادبی اور تہذیبی اثاثہ محفوظ ہے نہ صرف اپنایا ہے۔ بلکہ اسے زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور جدید تصورات سے ہمکنار کر کے اس میں نئے رنگ بھی بھرے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی ایک جگہ کہتے ہیں۔

اک عشق ہی کیا شعلہ فشاں میری غزل میں
پنہاں ہیں رموزِ دوجہاں میری غزل میں
ہر شعر ہے مجموعۂ احساس و صداقت!
ہر لفظ ہے نشتر کی زباں میری غزل میں

شکیل کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت بیان کی بے پناہ جاذبیت اور احساس کی شدت ہے۔ اور اسی چیز نے انھیں دور حاضرہ کے شاعروں میں مقبول اور ممتاز بنایا ہے

نظریاتی طور پر انھوں نے غزل کی پرانی روایات کو ختم کر کے کسی نئی روایت کو جنم نہیں دیا۔ کیونکہ پرانی روایات کو یکسر ختم کر دینا نہ تو کسی فنکار کے بس کی بات

ہے۔ اور نہ مستحسن اور مفید اقدام، ادب کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ آج تک کوئی فنکار ماضی کی روایت کو یکسر نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہر دور کے اچھے فنکاروں نے ماضی کی صحت مند روایات کو سینے سے لگایا ہے۔ اور انھیں اپنے فن کی بنیاد بنا کر مستقبل کی شاہراہیں تلاش کی ہیں۔ شکیلؔ نے بھی ایک سلجھے اور سنبھلے ہوئے فنکار کی حیثیت سے ماضی کی روایات کو حال کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے۔ اور پھر غزل کے ان قدیم عناصر کو جو بے جا انفعالیت، بے سروپا قنوطیت اور جنسی بے اعتدالی کے مظاہر لئے ہوئے تھے، مٹتے ہوئے ماضی کے ساتھ دفن ہو جانے کے لئے تنہا چھوڑ دیا ہے اور صحت مند محبت اور صحت مند زندگی کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی حالات اور معاشی مسائل کو بھی پیراہن تصویر پہنایا ہے۔

شکیلؔ کسی مخصوص مدرسۂ فکر یا سماجی نظریے کے پابند نہیں ہیں۔ بلکہ ایک عام مخلص اور حساس فنکار کی حیثیت سے وہ جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ اسے زبان و بیان کی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان کی آواز ایک مصلح کی آواز نہیں۔ ایک مطرب کی آواز ہے۔ وہ مبلغ کم اور مغنی زیادہ ہیں۔ ان کی شاعری ناقد کی زبان نہیں، درد مند کا دل ہے۔ مجاہد کے ہاتھ کی تلوار نہیں۔ فن کار کے نگر کا نشتر ہے "صنم و حرم"۔۔۔ "رعنائیاں" کے شاعر کے ذہنی اور فنی ارتقا کی اگلی منزل ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ یہ مجموعہ پڑھنے والوں کے ہر طبقے اور ہر مدرسۂ خیال میں یکساں مقبول ہوگا۔ اور انھیں غزل کی جدید صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں مدد دے گا۔

ساحرؔ لدھیانوی بمبئی نومبر سنہ ۱۹۵۰ء

عرضِ مصنّف

رعنائیاں اور نغمۂ فردوس کے بعد یہ تیسرا مجموعۂ کلام بنام صنم و حرم سیفی برادران مالکان تاج آفس بمبئی کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مجموعہ میں وہ غزلیات شامل ہیں جو میں نے ۱۹۴۴ء سے لے کر ۱۹۵۰ء کے آخر تک کہی ہیں، ہر چند کہ فلمی دنیا میں شامل ہونے اور ادبی ماحول سے دور رہنے کے بعد ایک نازک شاعر کا ذوق لطیف ضرور مجروح ہونا چاہیئے۔ پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے حتی الامکان علمی فراست پر فلمی حماقت کو مسلّط نہ ہونے دیا اور اس تجربہ میں ایک حد تک کامیاب رہا۔ حالانکہ ملک میں اب نہ وہ پہلی سی ادبی سرگرمیاں ہیں۔ نہ وہ یارانِ نکتہ سنج ہیں نہ وہ شعر و شاعری کی محفلیں ہیں۔ لیکن دل و دماغ کی خلوتیں ہر یک نفس ان سب کو مہیا کر دیتی ہیں۔ اور اکثر جذبات میں وہی روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو آج سے چند سال پیشتر تھی۔ زندگی شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور یکایک نغمے ابل پڑتے ہیں۔ مگر "سننے والے سینکڑوں ہیں ہم نوا کوئی نہیں" کا مصداق بن کر رہ جاتے ہیں۔
فلمی مصروفیات نے حالانکہ علمی صحبتوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ پھر بھی گاہ گاہ ادب نوازوں کے اصرار پر ادبی محفلوں میں شرکت کر ہی لیتا ہوں میں اپنے احباب کا ممنون ہوں۔ جن کے فیض صحبت نے مجھے اپنی فطری صلاحتیں برقرار رکھنے کے مواقع عطا فرمائے ہیں۔ دل سے نکلے ہوئے نالوں کی تشہیر کا سہرا سیفی برادران کے سر ہے۔ جنہوں نے اس دبی ہوئی آگ کو کاغذی صورت میں آپ کے سامنے پیش

گیا ہے۔ میں اس سلسلے میں اپنے محب محترم جناب فراق گورکھپوری کا بھی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنھوں نے اپنی محبّت کی بنا پر اس کتاب میں بطور مقدمہ چند سطور عنایت فرمائیں۔ اور مکرمی ساحر لدھیانوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اس کتاب پر ایک مختصر سی تقریظ لکھ کر مجھ پر احسان فرمایا۔

یہ مجموعہ بھی غزلیات پر مشتمل ہے۔ کچھ نظمیں بھی ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ غزلیات دورِ رفتہ کی یادگار ہیں۔ غالباً آنے والے دور کا ادب کچھ اس سے مختلف ہوگا۔ کیونکہ تاریخ کے ساتھ رجحانات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ گذرے ہوئے "کل" کی یادگار کتابی صورت میں آج آپ کے سامنے پیش کر دوں مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ اربابِ فکر و نظر کو مایوس نہ کرے گا۔ اگر کہیں خامی نظر آئے تو معذرت خواہ ہوں اور اگر کچھ پسند آئے تو داد نہیں بلکہ دعا کا طالب ہوں فقط

شکیل ..... بدایونی

نعت

تمنّا ہے کہ مرتے وقت بھی ہم مسکراتے ہوں
زباں پر یا محمدؐ ہو جب اس دنیا سے جاتے ہوں
بنے اے کاش اس دم ساز ہستی آخری ہچکی
فرشتے نغمۂ صلِ علیٰ جب گنگناتے ہوں
مزہ جب ہے کہ ہم دیوانہ وار ان کی طرف جائیں
اشاروں سے شہِ ہر دوسرا ہم کو بلاتے ہوں
شبِ فرقت کی ان رنگینیوں پر جان و دل صدقے
تمہاری یاد ہو دل میں ستارے جھلملاتے ہوں
نہ کیوں اونچا ہو سارے انبیا سے مرتبہ ان کا
سفارش کر کے جو امت کو اپنی بخشواتے ہوں
سکوں کی ساعتوں میں کون ان کو بھول سکتا ہے
دمِ مشکل جو ہر اک بے نوا کے کام آتے ہوں
بیاں ہو کیا شکیلؔ اس بزمِ دل کی جلوہ سامانی
حبیبِ کبریا جس بزم میں تشریف لاتے ہوں

سلام بحضور امام

سلام ان پر شہید کربلا کہتے ہیں سب جن کو
ضیائے قلب و عین مصطفےٰ کہتے ہیں سب جن کو

جنھوں نے جان دے کر کر دیا اسلام کو زندہ
ہے جن کی یاد سے اب تک خدا کا نام تابندہ

وہ جن کے عزم مستحکم کا ہے چرچا زمانے میں
وہ جن کا نام ہے روشن خدائی کارخانے میں

وہ جن کے خوف سے کاشانۂ باطل لرزتے تھے
وہ جن کے دبدبے سے دشمنوں کے دل لرزتے تھے

وہ جن کی ایک ٹھوکر سے رواں چشمے ہوں کوثر کے
رہے جو تین دن پیاسے مگر سائے میں خنجر کے

انھیں کی ذات والا باعث تکمیل ایماں ہے۔
لقب جن کا حسینؓ ابن علیؓ شاہِ شہیداں ہے

نہ کیوں ہر حامئ دین مبیں بھیجے سلام ان پر

فدا ہیں جان و دل سے جان و دل والے تمام ان پر
یہ وہ تھے جنھوں نے لاج رکھ لی اہلِ ایماں کی
بڑھا دی دہر میں توقیر ہر مردِ مسلماں کی
بلاشک عام انسانوں سے اونچا ہے مقام ان کا
زمانے کے لئے درس مکمل ہے پیام ان کا
انھوں نے کر دیا ظاہر حقیقت کس کو کہتے ہیں،
شہادت کا ہے کیا مطلب شہادت کس کو کہتے ہیں
کبھی روکے سے طوفان صداقت رک نہیں سکتا
کسی کا سر کسی انساں کے آگے جھک نہیں سکتا

دیباچہ

یہ سکوت اور یہ بے نقش قدم رہگذار
دو طرف حد نظر تک یہ درختوں کی قطار
اب تک اس راہ سے شاید کوئی گذرا ہی نہیں
اور جو گذرا تو فقط قافلۂ لیل و نہار
سینۂ راہ پہ یہ گھاس جو اگ آئی ہے
کاش اسے آ کے کوئی چھانٹ ہی دیتا اک بار
ورنہ یہ حسنِ سر راہ کو کر دے گی تباہ
جیسے اس دور میں اک شاعرِ بے رنگ و بہار
اپنے دیوان کی اشاعت ہو جسے مدّ نظر
اور دیوان بھی ایسا جو ہو مطلق بے کار
ماحصل جس کا ہو تحصیل زر و نام و نمود
جس دن آئے گا تہہ پنجۂ تنقید نگار

پھر یہ اوراق سرِ راہ بھی پھٹ جائیں گے
گھاس کے ساتھ یہ دیوان بھی چھپ جائیں گے
لطف بر دوش مسرت بکنار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گذار آیا ہوں

جذب ہے غنچۂ معصوم کی نکہت مجھ میں
گم ہے رنگینئ گلزارِ محبت مجھ میں
بن کے شادابی عنوانِ بہار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گذار آیا ہوں

مری آنکھوں سے ٹپکتی ہے مسلسل مئے ناب
مری مخمور نگاہوں سے امنڈتی ہے شراب
دل میں لے کر اثرِ کیف و خمار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گذار آیا ہوں

میں نے دیکھی ہے جنوں کوشئ رقصِ بسمل
میں نے دیکھے ہیں نگاہوں سے الجھتے ہوئے دل
چاک دل چاک نظر سینہ فگار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گذار آیا ہوں

اب کہاں دل کو مرے ضبط الم پر قابو
اب کہاں سلسلۂ عشرت و غم پر قابو
کھو کے محفل میں تری صبر و قرار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گزار آیا ہوں

وہی پھولوں کی مسرت وہی غنچوں کی امنگ
وہی مستی، وہی عالم، وہی خوشبو وہی رنگ
بن کے سرتا بہ قدم فصلِ بہار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گزار آیا ہوں

غم کا احساس محبّت کا اثر وقت کی چال
ٹوٹتا ہی نہیں یہ سلسلۂ خواب و خیال
سوچتا ہوں میں کبھی رات کی تنہائی میں
جانے کیا بھید ہے اس انجمن آرائی میں

حاملِ سوزِ دروں شمع کی فطرت کیوں ہے؟
پھول کو خندۂ مغموم کی جرأت کیوں ہے؟
کتنی آنکھوں میں مقید ہیں لہو کے دریا
مضطرب کتنی زبانوں پہ ہے احوال جفا

کتنی مایوس نگاہوں میں فسانے ہیں نہاں
کتنے اترے ہوئے چہروں پہ جنوں ہے رقصاں
کتنی ناکام دعائیں ہیں اثر سے محروم
کتنی بھیگی ہوئی راتیں ہیں سحر سے محروم
سوچتے سوچتے ہوتی ہے طبیعت جو اداس
کوئی چپکے سے یہ کہتا ہے کہ غم کا احساس
غم کا احساس، محبت کا اثر، وقت کی چال
ٹوٹتا ہی نہیں یہ سلسلۂ خواب وخیال،
چونک پڑتا ہوں جب اس خواب سے حیراں ہوکر
اپنے کمرے کی تصویر پہ کرتا ہوں نظر
ان تصاویر کی تخئیل میں کھو جاتا ہوں
اور تصاویر سمجھتی ہیں کہ سو جاتا ہوں
آہ یہ شاعرِ وارفتہ و آوارہ مزاج
جس کی آزاد خیالی نہیں پابندِ رواج
جس کے قدموں پہ جھکی جاتی ہے شہرت کی جبیں
جس کی ٹھوکر سے ہیں وابستہ زر و مال وزمیں

مجھ کو حیرت ہے ان آنکھوں سے ہیں کیوں اشک رواں
اس کے اشعار میں پوشیدہ ہے کیوں برقِ تپاں

آہ! وہ مضطرب افسردہ و آوارہ، مزاج
جس کو حاصل ہے سرورِ ابدی کی معراج

جس کی آواز پہ قرباں ہو امید حیات
جس کا ہر نغمۂ نو حاصلِ تفسیرِ حیات

اس کے رخ پر بھی ہیں آثار پریشانی کے
جانے اسباب ہیں کیا سوختہ سامانی کے

سوچتے سوچتے پڑ جاتی ہے جب دل پہ نظر
کوئی چپکے سے یہ کہتا ہے "محبت کا اثر"

غم کا احساس، محبت کا اثر وقت کی چال
ٹوٹتا ہی نہیں یہ سلسلۂ خواب و خیال

جب محبت کے بھی اس راز کو پا لیتا ہوں
جانے کیا سوچ کے اخبار اٹھا لیتا ہوں

پڑھتے پڑھتے کسی طوفان میں بہہ جاتا ہوں
سوچتے سوچتے دل تھام کے رہ جاتا ہوں

آہ دنیا غم و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی دام سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں
بیکسی یاس و الم درد خلش چیخ و پکار
کہیں ہستی سے محبت کہیں ہستی سے فرار
زر کی جھنکار میں مزدور کی آہیں پنہاں
نقرئی طور میں ناکام نگاہیں پنہاں
زرد چہروں پہ دہکتی ہوئی جذبات کی آگ
خشک ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے امید کی راگ
سوچتے سوچتے ہوتی ہے طبیعت جو نڈھال
کان میں چپکے سے کہتا ہے کوئی وقت کی چال
غم کا احساس، محبّت کا اثر، وقت کی چال
ٹوٹتا ہی نہیں یہ سلسلۂ خواب و خیال

روزن

بلاؤں نے تجلی خانۂ ہستی کو گھیرا ہے
جہاں کل روشنی تھی اب اندھیرا ہی اندھیرا ہے
نظر آتی نہیں صورت کسی اپنے پرائے کی
صدائیں صرف سنتا ہوں یہ میرا ہے یہ تیرا ہے
چپکتی ہے مرے تلوؤں سے کیوں بھیگی ہوئی مٹی
لہو ہے یا کسی نے جابجا پانی بکھیرا ہے
یہ کس کے جسم سے ٹکرا کے ٹھوکر کھا رہا ہوں میں
ارے اس جسم پر تو فاقہ مستی کا بسیرا ہے
صدائیں گھنگروؤں کی گونج اٹھیں کیوں فضاؤں میں
یقیناً اپنی دولت پر کسی نے ہاتھ پھیرا ہے
ارے یہ روزن دیوار میں تابندگی کیسی
کوئی ایسی بھی دنیا ہے جہاں اب تک سویرا ہے

دنیا یہی ہے، دنیا یہی ہے

چالاک دنیا، عیار دنیا۔ بد خلق دنیا۔ بدکار دنیا
خونریز دنیا۔ خونخوار دنیا۔ حرص و ہوس کی دلدار دنیا
کچھ کہہ رہی ہے کچھ کر رہی ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے
ہر سمت نالے ہر سمت آہیں۔ مغموم رہرو۔ افسردہ راہیں
جاں سوز اشارے۔ ظالم نگاہیں۔ ویران کر دیں جس کو چاہیں
افسردگی سی افسردگی ہے۔ دنیا یہی ہے، دنیا یہی ہے
چھوڑی پدر سے اپنی کمائی گیا کہے دل میں۔ کیا سنے سمائی
بن بیٹھا دشمن، بھائی کا بھائی۔ تھوڑی سی دولت جب دیکھ پائی
رسم محبت سوداگری ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے
دیکھو وہ مجرم۔ پکڑا گیا ہے۔ زنداں کی سختی۔ اس کی سزا ہے
خلوت میں لیکن۔ عالم جدا ہے۔ منصف کو مجرم کچھ دے رہا ہے
اب جو بھی کچھ ہے۔ خانہ پری ہے۔ دنیا یہی ہے، دنیا یہی ہے

وہ دونوں بھائی۔ جینے سے عاری مظلوم سوز سرمایہ داری
جن کے سروں پر ہیں بوجھ بھاری۔ لوٹیں گے گھر کو، با آہ وزاری
ماں ان کی گھر پر مردہ پڑی ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے

اس جھونپڑی میں معصوم بچے۔ چلا رہے ہیں فاقوں کے مارے
لیکن زمیندار ہنستے ہنساتے۔ وہ جا رہے ہیں دامن بچائے
غربت پہ خنداں آسودگی ہے۔ دنیا یہی ہے۔ دنیا یہی ہے

کوٹھے پہ دیکھو۔ نظریں اٹھا کر۔ وہ اک حسینہ خود کو سجا کر
غمزوں کی ماری۔ غیرت مٹا کر۔ دولت کی خاطر عصمت گنوا کر
کس درجہ شاداں۔ بیٹھی ہوئی ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے

ہاں ہاں وہ دیکھو۔ دونوں پڑوسی۔ اک دوسرے کے دشمن ہیں جانی
اس گھر میں ماتم، اس گھر میں شادی۔ آتش ہے ارزاں کلفت ہے سستی
عقل و خرد کیا۔ دیوانگی ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے

دیکھو وہ کیا ہے۔ مٹی کا تودا۔ ہمشکل انساں۔ بے ڈول فربہ!
مکار فطرت۔ ظالم کمینہ۔ فطرت میں جس کی ہے۔ خون پینا
دولت پہ ناگن بیٹھی ہوئی ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے

دیکھو وہ لیڈر جلسے میں آئے۔ جنتا نے ان کے نعرے لگائے۔
مشتاق جلوہ۔ اپنے پرائے۔ کس کی مصیبت کیا ہائے ہائے
فکر و عمل سے۔ شہرت بھلی ہے۔ دنیا یہی ہے۔ دنیا یہی ہے

دیکھو وہ ابھرا شاعر ہمارا۔ فکر و نظر کا۔ لے کر سہارا
اہل حسد کو۔ کیوں ہو گوارا۔ وہ کسمسائے وہ تیر یارا
فطرت میں داخل تنہا روی ہے۔ دنیا یہی ہے۔ دنیا یہی ہے

محفل کو واعظ۔ تڑپا رہے ہیں سب کو نصیحت فرما رہے ہیں
"جو" کی حقیقت سمجھا رہے ہیں "دالوں" کی عظمت بتلا رہے ہیں
آج ان کے گھر پر مرغی کٹی ہے، دنیا یہی ہے۔ دنیا یہی ہے

ہشیار بیدار۔ اے فاقہ مستو۔ وقت آگیا ہے۔ جڑ ان کی کھاد
برباد کردو۔ کمزوریوں کو۔ دنیا کہاں ہے۔ یہ مجھ سے پوچھو
اہل دل کے دل میں چھپی ہے۔ دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے

بے خودی

فضا میں خلفشار ہے۔ زمانہ بے قرار ہے
نہ موسم بہار ہے۔ نہ وقت سازگار ہے
نہ عیش کامگار ہے، نہ غم پہ اختیار ہے
سکوں ذلیل و خوار ہے۔ جنوں پہ انتشار ہے
مگر نہیں، مگر نہیں مجھے تو کچھ خبر نہیں
مرا یہاں گزر نہیں، نظر مری نظر نہیں
اسیر بے خودی ہوں میں
رہین زندگی ہوں میں!
مجھے کسی کا ڈر نہیں میں اپنی دھن میں مست ہوں
یہ کون ہے چھپا ہوا۔ مرے دل خراب میں
یہ کس کی آرزو ہے، جہان اضطراب میں
یہ کس کا غم ہے رقص کن، مسرتوں کے خواب میں
یہ کس کا عکس موجزن ہے ساغر شراب میں

سنے کوئی تو کچھ کہوں، مثالِ اشک غم بہوں
ستم سہوں جفا سہوں خوش کس لئے رہوں
مری خوشی مرا الم
سرورِ شوق کیوں ہو کم
مجھے کسی کا ڈر نہیں میں اپنی دھن میں مست ہوں

ربابِ شوق میں ہے گم، شکستِ دل کی ہر صدا
دلیلِ ربط و ضبط ہے۔ خیالِ ترکِ مدّعا
دلِ حزیں میں حسرتیں نظر کو تیرا آسرا
مری طرف بھی دیکھ لے کبھی تو میرے ساقیا
اٹھا سبو، چمن میں آ۔ گلوں کی انجمن میں آ
جنوں کے پیرہن میں آ۔ بہار کے وطن میں آ
بہار تک جیوں گا میں
پیوں گا میں پیوں گا میں
مجھے کسی کا ڈر نہیں میں اپنی دھن میں مست ہوں

تصوراتِ زندگی، نگاہ کے اثر میں ہیں
وہ ابتدا کے مرحلے ابھی مری نظر میں ہیں

مگر یہ اشک آہ اب، جو میرے چشم تر میں ہیں
نثار ان پہ دولتیں جو دست اہل زر میں ہیں
انھیں میں کوئی بات ہے یہی حریم ذات ہے
جہاں یہ کائنات ہے جدھر مری حیات ہے
میں سر وہیں جھکاؤں گا
وہیں حرم بناؤں گا
مجھے کسی کا ڈر نہیں میں اپنی دھن میں مست ہوں

شب مہتاب

شب مہتاب و شام زندگانی یاد آتی ہے
مجھے پھر آج اک بھولی کہانی یاد آتی ہے

کسی کا وہ مری خلوت میں شرماتے ہوئے آنا
تلاطم خیز رفتار جوانی یاد آتی ہے

دل بیتاب کا وہ عالم وارفتگی توبہ
نگاہ شوق کی وہ بے زبانی یاد آتی ہے

لبوں پر ہائے وہ شکر کرم بے لفظ و بے معنی
حواس و ہوش کی وہ سرگرانی یاد آتی ہے

وہ ان کا دفعتاً آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا
ہمیں اکثر تمہاری خوش بیانی یاد آتی ہے

وہ انداز غزل گوئی تمہاری ہم نہ بھولیں گے
ابھی تک وہ ادائے شعر خوانی یاد آتی ہے

جواباً وہ مرا ان سے بمشکل عرض کر دینا

ہمیں بھی آپ کی وہ قدر دانی یاد آتی ہے
ہوئی تھی جو ہمارے حال پر اشعار کے بدلے
وہ شفقت وہ کرم وہ مہربانی یاد آتی ہے
یہ سب کچھ ہے مگر او میری دنیا لوٹنے والے
کبھی تجھ کو مرے دل کی کہانی یاد آتی ہے
مرے اشعار کا مطلب بھی سمجھا ہے کبھی تو نے
مرے جذبات کی بھی ترجمانی یاد آتی ہے
تری خاطر جلی جاتی ہے جو سوز محبت میں!
کبھی تجھ کو وہ شمع زندگانی یاد آتی ہے
مجھے تو تیری زلفوں کا مہکنا یاد آتا ہے
تجھے بھی میرے اشکوں کی روانی یاد آتی ہے
سنا جب حال دل چہرے پہ یوں رنگ حجاب آیا
نئے ماحول میں جیسے پرانی یاد آتی ہے
سنبھالا خود کو پہلے پھر کہا شرماتے شرماتے
نہ ہوتی گر خلش کوئی تو ہم خلوت میں کیوں آتے

غزلیات

اک عشق ہی کیا شعلہ فشاں میری غزل میں
پنہاں ہیں رموز دو جہاں میری غزل میں
تعمیر کے پہلو ہیں نہاں میری غزل میں
ملتا نہیں رجعت کا نشاں میری غزل میں
دیکھے تو کوئی دیدۂ ادراک و یقیں سے
ہر منظر فطرت ہے جواں میری غزل میں
اردو کو جس انداز بیاں کی ہے ضرورت
ملتا ہے وہ اندازِ بیاں میری غزل میں
بچ بچ کے نگاہ و دل ارباب ہوس سے
پائی ہے محبت نے اماں میری غزل میں
محدود نہیں۔ دائرہ رنگ تغزل
ہر شعبۂ ہستی ہے نہاں میری غزل میں
ہر شعر ہے مجموعہ احساس و صداقت

ہر لفظ ہے نشتر کی زباں میری غزل میں
منظوم ہے میرے ہی خیالات کی تاریخ
کیا ذکر حدیث دگراں میری غزل میں
محبوب کی خلوت پہ نظر میرے سخن کی
مظلوم کی آہوں کا دھواں میری غزل میں
مسجد کے مراحل کہیں میخانے کی باتیں
افسانۂ ہر پیر و جواں میری غزل میں
کچھ سلسلۂ چنگ و دف و بربط و مضراب
کچھ تذکرۂ تیغ و سناں میری غزل میں
بھڑکے گی یوں ہی آتش ماحول کہاں تک
جذبات کے دریا ہیں رواں میری غزل میں
ہے ظلم شکیل اہل سیاست کا یہ ورنہ
گنجائش تنقیص کہاں میری غزل میں

وہ یوں کھو کر مجھے پا یا کریں گے
مرا افسانہ دہرا یا کریں گے

ستم اپنے جو یاد آیا کریں گے
تو دل ہی دل میں چھپتا یا کریں گے
غرورِ حسن کو باطل سمجھ کر
سراپا عشق بن جایا کریں گے
نہ ہوگی تاب ضبطِ غم جب ان کو
یقیناً اشک بھر لایا کریں گے
قیامت ہوں گی نازک دل کی آئیں
ہر اک ذرے کو تڑپایا کریں گے
فلک ماتم کرے گا بے کسی پر
مہ و انجم ترس کھایا کریں گے
مجھے ہر گام پر ٹھکرانے والے
مجھی پر ناز فرمایا کریں گے
نہ ہوگی جب سکوں کی کوئی صورت
کچھ اپنے دل کو سمجھایا کریں گے
ہر ایک تدبیر جب ناکام ہوگی
تو مجھ کو روبرو پایا کریں گے

نگاہوں سے ملا کر وہ نگاہیں!
یکایک رخ بدل جایا کریں گے
وہی ناز و ادا کی شکل ہوگی
اسی صورت سے شرمایا کریں گے
میں کہتا ہی رہوں گا قصۂ غم
وہ سنتے سنتے سو جایا کریں گے
مگر جب ختم ہوگا عالمِ خواب
نہ پا کر مجھ کو گھبرایا کریں گے
شکیل اپنے لئے لمحاتِ فرصت
پیام لذبہ نو لایا لایا کریں گے

مجھے آرزوئے ستم ہی تھی مگر اس نے درسِ وفا دیا
میں نثارِ بخششِ حسن کے مرے ظرف سے بھی سوا دیا
میں وہ ایک پرتوِ حسن تھا جسے بے رخی نے چھپا دیا
وہ خود آئینے سے تو کیا ہٹے مجھے سامنے سے ہٹا دیا
تری انجمن کی حدود تک مرا دل تھا غافلِ رنگ و بو

ترے ہجر نے غمِ عشق کو غمِ روزگار بنا دیا
مجھے سوزِ طور کا غم نہیں مگر اے تجلّیٔ برق زا
جو حجابِ روئے جمال تھا وہ نقاب کیوں نہ جلا دیا
یہ گھڑی گھڑی کی شکایتیں یہ جفا و غم کی حکایتیں
دلِ ہوش مند خبر بھی ہے تجھے کس نے درسِ وفا دیا
مرے حالِ زار کو دیکھ کر سب اٹھاتے تھے مجھ پہ انگلیاں
وہ تو حادثاتِ زمانہ نے مجھے اجنبی سا بنا دیا
میں اسے کسی کی وفا کہوں کہ تشکیلِ عینِ وفا کہوں
اگر ایک بار ہنسا دیا تو ہزار بار رلا دیا

بس اک نگاہِ کرم ہے کافی اگر انھیں پیش و پس نہیں ہے
زہے تمنا کہ میری فطرت اسیرِ حرص و ہوس نہیں ہے
نظر سے صیاد دور ہو جا یہاں ترا مجھ پہ بس نہیں ہے
چمن کو برباد کرنے والے یہ آشیاں ہے قفس نہیں ہے
کسی کے جلوے تڑپ رہے ہیں حدودِ ہوش و خرد سے آگے
حدودِ ہوش و خرد سے آگے نگاہ کی دسترس نہیں ہے

جہاں کی نیرنگیوں سے یکسر بدل گئی آشیاں کی صورت
قفس سمجھتی ہیں جن کو نظریں وہ درحقیقت قفس نہیں ہے

کہاں کے نالے، کہاں کی آہیں، جمی ہیں ان کی طرف نگاہیں
کچھ اس قدر محو یاد ہوں میں کہ فرصت یک نفس نہیں ہے

تصورِ عشرت گذشتہ کا حسنِ تاثیر اللہ اللہ
وہی فضائیں وہی ہوائیں چمن سے کچھ کم قفس نہیں ہے

کسی کی بے اعتنائیوں نے بدل ہی ڈالا نظام گلشن
جو بات پہلے بہار میں تھی وہ بات اب کے برس نہیں ہے

یہ بوئے سنبل یہ خندۂ گل اور آہ یہ دکھ بھری صدائیں
قفس کے اندر چمن ہے شاید چمن کے اندر قفس نہیں ہے

نہ ہوش خلوت نہ فکر محفل عیاں ہو اب کس پہ حالت دل
میں آپ ہی اپنا ہم نفس ہوں میرا کوئی ہم نفس نہیں ہے

کریں بھی کیا شکوۂ زمانہ، کہیں بھی کیا درد کا فسانہ
جہاں میں ہیں لاکھ دشمن جاں کوئی مسیحا نفس نہیں ہے

سنی ہیں اہل جنوں نے اکثر خموشیٔ مرگ کی صدائیں
سنا یہ تھا کاروان ہستی رہین بانگ جرس نہیں ہے

چمن کی آزادیاں مؤخر تصور آشیاں مقدم
غم اسیری ہے نامکمل اگر غم خار و خس نہیں ہے

نہ کر مجھے شرمسار ناصح میں دل سے مجبور ہوں کہ جس کا
ہے یوں تو کون و مکاں پہ قابو مگر محبت پہ بس نہیں ہے

کہاں وہ امید آمد آمد کہاں یہ الفائے عہد فردا
جب اعتبار نظر نہ تھا کچھ اب اعتبار نفس نہیں ہے

وہی ہیں نغمے وہی ترانے سن اے مجھے بھول جانیوالے
تری سماعت سے دور ہیں یہ جبھی تو نالوں میں رس نہیں ہے

تشکیل دنیا میں جس کو دیکھا اس کی دنیا ہی اور دیکھی
ہزار نقاد زندگی ہیں مگر کوئی نکتہ رس نہیں ہے

ان کے بغیر ہم جو گلستاں میں آگئے
محسوس یہ ہوا کہ بیاباں میں آگئے

تشہیر دل گرفتگی حسن ہو گئی
آنسو چھلک کے چشم پشیماں میں آگئے

ہم ترک ربط و ضبط محبت کے باوجود

سو بار کھچ کے کوچۂ جاناں میں آ گئے

پھولوں کو راس آیا نہ جب عرصۂ بہار
گلشن سے ہٹ کے گوشۂ داماں میں آ گئے

ہر چند اہلِ ہوش تھے اربابِ زندگی
لیکن فریبِ گردشِ دوراں میں آ گئے

آیا مری زباں پہ یکایک جوان کا نام
کس کس کے ہاتھ میرے گریباں میں آ گئے

چھپ کر نگاہِ شوق سے دل میں پناہ لی
دل میں نہ چھپ سکے تو رگِ جاں میں آ گئے

تھے منتشر ازل میں جو ذراتِ کوئے دوست
انسان بن کے عالمِ امکاں میں آ گئے

جن کی ادا ادا میں ہیں رعنائیاں تشکیل
اشعار بن کے وہ مرے دیواں میں آ گئے

توڑے کے سحر یاد گذشتہ جشنِ بہاراں کیوں نہ کریں
خواب گلستاں دیکھنے والے عزم گلستاں کیوں نہ کریں

رونقِ بزم اک چیز ہے لیکن اور ہی ساماں کیوں نہ کریں
گھر میں چراغاں کرنے سے حاصل دل میں چراغاں کیوں نہ کریں

مست گھٹائیں جام بہ کف مخمور فضائیں توبہ شکن
شانِ کریمی تو ہی بتا پھر جرأتِ عصیاں کیوں نہ کریں

حسن مجسّم عشق و محبّت عشق سراپا جذب و کشش
میری پریشانی کے افسانے ان کو پریشاں کیوں نہ کریں

دیدِ رخِ جاناں کی تلافی یادِ رخِ جاناں ہی سہی
شامِ الم جب رنگ دکھائے شمع فروزاں کیوں نہ کریں

موسمِ گل ہے گل کا جنوں اور گل کا جنوں ہے اپنا جنوں
موسمِ گل میں ہنس ہنس کر ہم چاکِ گریباں کیوں نہ کریں

ان کے بھی سینے میں دل ہے دل میں خلش بھی ٹیس بھی ہے
پھر وہ قیسؔ دردِ محبت پرسشِ پنہاں کیوں نہ کریں

فروغِ حسنِ کرم کا حاصل غمِ جفائے تمام کیوں ہے
سحر کی تابانیاں مسلّم مگر یہ پہلو میں شام کیوں ہے
فضائے بے کیفیٔ محبت امینِ کیفِ دوام کیوں ہے

اگر نہیں دل کو غم سے راحت تو زندگی شاد کام کیوں ہے
اڑائی واعظ نے چھپ کے پیہم چڑھائی رندوں نے ملکے باہم
یہاں تو یہ سوچتے ہی گزری کہ بادہ نوشی حرام کیوں ہے
نہ ذکرِ عنواں نہ حرفِ مطلب ادھر خموشی اس طرف تغافل
تو پھر یہ افسانۂ محبت زبانِ زدِ خاص و عام کیوں ہے
انھیں کو تھی ذکرِ مے سے نفرت یہی تھے زاہد یہی تھے حضرت
ذرا کوئی ان سے یہ تو پوچھے، اب ان کے ہاتھوں میں جام کیوں ہے

یوں برقِ بے اماں کو تپانا ہے ایک دن
خود آشیاں کو آگ لگانا ہے ایک دن
شانِ غرورِ عجز دکھانا ہے ایک دن
سجدوں سے نقشِ پا کو مٹانا ہے ایک دن
حالِ دلِ تباہ سے غافل نہیں ہوں میں
طوفاں سے ناخدا کو بچانا ہے ایک دن
ظالم میری اداسی رخ پر نہ مسکرا
تجھ کو بھی اس مقام پہ آنا ہے ایک دن

مدہوشیوں سے کھیل رہا ہوں بہ ہر نفس
یہ سوچ کر کہ ہوش میں آنا ہے ایک دن
یہ بزم رنگ و بو ہے کہ ان کی حریم ناز
سب کچھ یہیں پہ چھوڑ کے جانا ہے ایک دن

نہ فروغ بام کی جستجو نہ ضیائے در کی تلاش ہے
جو کسی کی راہ میں کھو گئی مجھے اس نظر کی تلاش ہے
تجھے پا سکے کہ نہ پا سکے یہ نظر نظر کی تلاش ہے
کہیں ایک لمحے کی جستجو، کہیں عمر بھر کی تلاش ہے
غم تیرگی سے اجڑ گئیں وہ اجڑ گئیں وہ تصورات کی محفلیں
کبھی شام غم ہی عزیز تھی مگر اب سحر کی تلاش ہے
مری زندگی پہ کرم کریں غم روزگار کی تلخیاں
میں خراب کوچہ دشت ہوں مجھے اپنے گھر کی تلاش ہے
میں امین منزل منفرد روش عوام سے کیا مجھے
جو نقوش خوردہ پا نہ ہوا سی رہگذر کی تلاش ہے۔
ہیں سرور عزم سے بے خبر مرے پائے شوق کی جراتیں

ابھی کاروانِ حیات کو کسی راہبر کی تلاش ہے

مجھے ایک لحظہ سکوں نہیں یہ تضاد ہوش تو دیکھئے

کبھی دردِ دل سے ہوں مطمئن کبھی چارہ گر کی تلاش ہے

ان سے امید رو نمائی ہے

کیا نگاہوں کی موت آئی ہے

حسن مصروفِ خود نمائی ہے

عشق کا دور ابتدائی ہے

دل نے غم سے شکست پائی ہے

عمر رفتہ تری دہائی ہے

دل کی بربادیوں پہ نازاں ہوں

فتح پا کر شکست کھائی ہے

میرے معبد نہیں ہیں دیر و حرم

احتیاطاً جبیں جھکائی ہے

وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی

ہائے کس وقت نیند آئی ہے

کھل گیا ان کی آرزو میں یہ راز
زیست اپنی نہیں پرائی ہے
شمع و پروانہ ہوں کہ غنچہ و گل
زندگی کس کو راس آئی ہے
گل فسردہ چمن اداس شکیل
یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

کبھی تو کام یارب جذبۂ احساس آجائے
وہ ظالم خود بہ خود گھبرا کے میرے پاس آجائے
ملے پھر کاش میری گرمیٔ انفاس آجائے
زمانے کو ہوائے زندگانی راس آجائے
چمن میں یوں تو دھوکے ہیں ہزاروں رنگ کے لیکن
وہی گل ہے کہ جس گل میں تری بو باس آجائے
میں ہر غم سے الجھتا جا رہا ہوں اس توقع پر
کوئی ان میں سے شاید زندگی کو راس آجائے
تری منزل ورائے منزلِ موہوم ہے اے دل

گذر جانا اگر کوئی مقام یاس آجائے

یقین کر ناصح مشفق جو میں تیری جگہ ہوتا
نو شاید یہ دعا کرتا محبت راس آجائے

شکیل اپنی محبت ڈھونڈتا ہوں ذرے ذرے میں
تمنا ہے کہ میری چیز میرے پاس آجائے

جو دل پہ گذرتی ہے وہ سمجھا نہیں سکتے
ہم دیکھنے والوں کو نظر آ نہیں سکتے

بے قید رسوم آئی ہیں گلشن میں بہاریں
اب ہاتھ گریباں کی طرف جا نہیں سکتے

رنگینیٔ مستقبل روشن ہے نظر میں
ہم تلخیٔ ماحول سے گھبرا نہیں سکتے

مغرور نہ ہو فصلِ خزاں آکے چمن میں
ایسے بھی ہیں کچھ پھول جو مرجھا نہیں سکتے

مانا وہ مجھے اپنی نگاہوں سے گرا دیں
لیکن مرے احساس کو ٹھکرا نہیں سکتے

ارباب خرد لاکھ سبک گام ہوں لیکن
بے فیض جنوں راہ طلب پا نہیں سکتے
مانا کہ ترے لطف کرم خواب ہیں لیکن
ہر شخص کو یہ خواب نظر آ نہیں سکتے
تفسیر دو عالم ہے شکیلؔ اپنا تغزل
میدان غزل چھوڑ کے ہم جا نہیں سکتے

ہوئی اک عمر ترک التجا کو
مگر ہاتھ اب بھی اٹھتے ہیں دعا کو
انھیں ضد ہے مری عرض وفا سے
نہ جانے کیا سمجھتے ہیں وفا کو
غرض کی زندگی مطلب کی دنیا
کہاں رکھوں دل بے مدعا کو
محبت کا یہ تلخ انجام توبہ
کوئی آواز دے رے ابتدا کو
جو ہیں کھوئے ہوئے ساز طرب میں

وہ کیا سمجھیں مرے دل کی صدا کو

شکیلؔ اپنی وفا کرتی ہے ہر بار
سلامِ آخری اس بے وفا کو

عروجِ فطرتِ آدم کو رسوا کر رہا ہوں میں
خدا کو بھول کر انساں کو سجدہ کر رہا ہوں میں

سکون و عیش کے ساماں مہیا کر رہا ہوں میں
حیاتِ چند روزہ پر بھروسا کر رہا ہوں میں

ترے پردے میں خود اپنی تمنا کر رہا ہوں میں
ارے توبہ محبت کو بھی رسوا کر رہا ہوں میں

غرورِ بے نیازی خود نمائی، خود آرائی،
جو تجھ میں ہیں وہی انداز پیدا کر رہا ہوں میں

بجا ترکِ وفا کی کوششیں لیکن تعجب ہے
یہ بے جا زحمتیں کیونکر گوارا کر رہا ہوں میں

ہے اک حسنِ عملِ پنہاں درونِ پردۂ ہستی
کسے معلوم اس پردے میں کیا کیا کر رہا ہوں میں

نہ ہو یارب کبھی تکمیل میرے اس ارادے کی
کہ اب ترکِ محبت کا ارادہ کر رہا ہوں میں
سرِ محشر مجھے شکوہ ہے اک جانِ تمنا سے
دلیلیں ہوش میں آئیں کہ دعویٰ کر رہا ہوں میں
نہ ساغر ہے نہ پیمانہ نہ ساقی ہے نہ میخانہ
شکیلؔ اب چند اشکوں پر گزارا کر رہا ہوں میں

جو نظر ہے مطمئن ہے جو نفس ہے شادماں ہے
کہ بقیدِ جورِ پیہم کوئی مجھ پہ مہرباں ہے
تری اک نظر کا حاصل عدم و وجودِ جاں ہے
کہیں زندگی کا عالم کہیں مرگِ ناگہاں ہے
ترے حسنِ ضو فگن سے یہ فروغِ گلستاں ہے
نہ ہو جس میں تیرا پرتو وہ بہار بھی خزاں ہے
مری گفتگو نمایاں ہے بغیر گفتگو بھی
میں سناؤں حالِ دل کیا کہ نظر ہی خود زباں ہے
مرے تیرے سوزِ دل کا نہیں بوالہوس تقابل

مری آگ میں شرر ہیں تری آگ میں دھواں ہے

کبھی پاؤں لڑکھڑائے تو کہا یہ مجھ سے دل نے
وہ چمک رہی ہے منزل وہ غبار کارواں ہے

جو ہوا اذنِ اہلِ گلشن تو میں ہر کلی سے کہہ دوں
ترا مضمحل تبسم مرے ذوق پر گراں ہے

یہی رنگ ہے تو کیوں کر ہو رسائی تا بہ منزل
کہیں اہلِ کارواں ہیں کہیں میرِ کارواں ہے

رہوں ترکِ معصیت پر میں شکیلؔ کیسے قائم
ابھی دل میں ولولے ہیں ابھی آرزو جواں ہے

آمدِ فصلِ خزاں کا جو نہ امکاں ہوتا
کس قدر حسن پہ مغرور گلستاں ہوتا

ابد آثار جو رنگ شبِ ہجراں ہوتا
کیوں کوئی صبح کے تاروں سے پشیماں ہوتا

کفر و ایماں کی سیاست سے ہے ناکارہ وجود
آدمی کام کا ہوتا اگر انساں ہوتا

کھل گیا تجزیۂ غم سے ہر اک رازِ حیات
زیست مبہم تھی اگر دل نہ پریشاں ہوتا
رعنائیٔ دل سوزاں کو دعا دے ظالم
ورنہ کیوں کر تری محفل میں چراغاں ہوتا
تو نے سوچا کبھی، دامن کو بچانے والے
کچھ سکت ہاتھ میں ہوتی تو یہ داماں ہوتا
عزم انسان ہے کہ بن جائے فرشتہ لیکن
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا
میری فطرت کو کہاں تابِ جمودِ ساحل
وہی کشتی وہی دریا وہی طوفاں ہوتا
سرد ہے انجمنِ شعر شکیلؔ ان کے بغیر
وہ مرے سامنے آتے ہیں غزل خواں ہوتا

نظروں پہ ستم دل پہ جفا ہو کے رہے گی
ہے جرمِ محبت تو سزا ہو کے رہے گی
اس درجہ ہو دل ان کی عنایت پہ نہ مغرور

اک دن یہی دو دن کی ہوا ہو کے رہے گی

پہلے سے نہ وہ دل ہیں نہ پہلا سا وہ عالم
اللہ یہ دنیا تری کیا ہو کے رہے گی

اے رہرو میخانہ نہ تو جنت کا نہ کر غم
جنت ترے قدموں پہ فدا ہو کے رہے گی

اب تو غمِ جاناں بھی سکوں بخش نہیں ہے
کیا یہ بھی خلش دل سے جدا ہو کے رہے گی

کیوں خوش نہ ہو دل بزمِ تصوّر کی لقا پر
دنیا تو نہیں ہے کہ فنا ہو کے رہے گی

احساس میں شامل ہے اگر حسنِ صداقت
آوازِ دل آوازِ خدا ہو کے رہے گی

اے حسنِ پشیماں مری آہوں سے نہ گھبرا
ہر آہ ترے حق میں دعا ہو کے رہے گی

برہم جو شکیلؔ ان کی نظر ہے تو بلا سے
دیکھوں وہ کہاں مجھ سے خفا ہو کے رہے گی

بہار آئی کسی کا سامنا کرنے کا وقت آیا
سنبھل اے دل کہ اظہارِ وفا کرنے کا وقت آیا
انھیں آمادۂ مہر و وفا کرنے کا وقت آیا
بڑی مدت میں عرضِ مدعا کرنے کا وقت آیا
رواں ہیں اپنے مرکز کی طرف آسودہ امیدیں
ہجوم یاس کو دل سے جدا کرنے کا وقت آیا
پھر اک گم کردہ راہ زندگی کو مل گئی منزل
سجودِ شکرِ بے پایاں ادا کرنے کا وقت آیا
کبھی دوری تھی لیکن اب خیالِ خوف دوری سے
فغاں کی ساعتیں گذریں دعا کرنے کا وقت آیا
کہاں تک ختم رہتا درمیاں پر دل کا افسانہ
بالآخر درمیاں سے ابتدا کرنے کا وقت آیا
ہر اک جرم محبت اس نگاہ لطف پر صدقے
تو بد عافیت لے کر خطا کرنے کا وقت آیا
نگاہ و دل سے اب تفسیر و شرح آرزو ہوگی
زبان و لب سے ترک التجا کرنے کا وقت آیا

وہ آتے ہیں شکیلؔ اب اپنے دل سے ہاتھ بیٹھو
نگاہ ناز کی قیمت ادا کرنے کا وقت آیا

اللہ اللہ مقام ضبط الم
ڈگمگاتے ہیں زندگی کے قدم

سعیٔ تشریح آرزو کی قسم
محرم آرزو نہ تم ہو نہ ہم

کھولنا تھا حیات نو کا بھرم
اک بہانہ تھا لغزش آدم

ہیں زمانہ میں عام جور و ستم
لیکن اب تک زمیں ہے زیر قدم

موجِ انفاس زاہداں توبہ
بجھ نہ جائے کہیں چراغِ حرم

زندگی ہے ورائے مرگ و حیات
ہیں نہیں قائل وجود و عدم

ہوشیار اے جبین سجدہ گزار

مٹ نہ جائے کسی کا نقش قدم
اس زمانے میں اور ذکر بہار
کس نے دیکھا بہار کا عالم
بھولنے والے یاد ہیں مجھ کو
وہ ترے وعدہ ہائے مستحکم
سائے کی طرح اب زمانہ شکیلؔ
چل رہا ہے مرے قدم بہ قدم

برائے نام جہاں دور بے سرور چلیں
شکیلؔ کیوں نہ ہم اس میکدے سے دور چلیں
نہ سمت وادیٔ ایمن، نہ سوئے طور چلیں
نگاہ دل پہ حجابیں ترے حضور چلیں
اس انجمن میں ریاکاریاں ہیں شامل عجز
چلو یہاں سے بصد نخوت و غرور چلیں
نسیم صبح میں نگہت نہ پھول میں خوشبو
یہی چمن ہے تو ایسے چمن سے دور چلیں

جو قدرِ حسن نہ جانیں مری طرف آئیں
جو رازِ عشق نہ سمجھیں ترے حضور چلیں

رفیقِ راہ نہ ہوں رہروانِ سُست قدم
جو ساتھ دے نہیں سکتے وہ ہم سے دور چلیں

یہ میکدہ ہے یہ مسجد ہے حضرت واعظ
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس طرف حضور چلیں

ہمارے سائے پہ بھی رشک تھا جنھیں تشکیل
خدا کی شان وہ اب ہم سے دور دور چلیں

نہ ساقی نہ مطرب نہ ساغر نہ مینا
گوارا ہو کیوں بے حیا بن کے جینا

ہر اک قطرہ خنجر ہر اک بوند نشتر
یہ آنسو ہیں یا زندگی کا پسینا

تلاطم سے زور آزما کر تو دیکھوں
بلا سے اگر ڈوب جائے سفینا

شفق حسن کو سنجھے ہوئے ہیں نگاہیں

ہے فطرت کے ہاتھوں میں سرخ آبگینا
چلو ان سے عرضِ وفا کر تو دیکھیں
وہ دادِ محبت نہ دیں گے یہی نا
بدلتا ہے ہر سانس کے ساتھ عالم
زمانہ ہی خود ہے ترقی کا زینا
شکیل اکثر احباب کا ہے یہ عالم
زباں پر حدیثِ وفا دل میں کینہ

یارب غرورِ حسن کو رسوا نہ کر سکوں
ہو تابِ دید بھی تو نظارہ نہ کر سکوں
اے جبرِ عشق مجھ کو عطا کر وہ اعتماد
ناکامیِ حیات کی پروا نہ کر سکوں
دیکھا ہے میں نے حسنِ گریزاں کو ملتفت
کیوں امتیازِ شبنم و دریا نہ کر سکوں
درمانِ زندگی تو مرے بس کی بات ہے
وہ درد دے کہ جس کا مداوا نہ کر سکوں

حائل حجاب خلوتِ ہجراں سہی مگر
شاید تری نگاہ سے پردا نہ کر سکوں

باوصفِ اشک و آہ بہ ایں حشرِ اضطراب
ممکن ہے تیرے غم کو میں رسوا نہ کر سکوں

ہو جائیں ترکِ شوق میں آسانیاں اگر
عجلت ہو اس قدر کہ ارادہ نہ کر سکوں

راہِ وفا میں ان کا سہارا نہیں قبول
وہ کام کیا جسے تنہا نہ کر سکوں

عالم محبتوں کا یہی ہے تو ایک دن
شاید یہ تذکرے بھی گوارا نہ کر سکوں

دل کے توہمات ہیں سب ورنہ اے شکیلؔ
میں اور ان سے عرضِ تمنا نہ کر سکوں

اثر دکھائے گی سعیٔ گراں کبھی نہ کبھی
بدل ہی جائے گا نظمِ جہاں کبھی نہ کبھی
بہار ہو کے رہے گی عیاں کبھی نہ کبھی

چمن کو چھوڑ ہی دے گی خزاں کبھی نہ کبھی

دل اس سراپا سے رہ سکے گا نہ دور
مکیں کو ڈھونڈ ہی لے گا مکاں کبھی نہ کبھی

شباب فصلِ بہاراں پہ جھومنے والے
غمِ بہار بھی ہو گا جواں کبھی نہ کبھی

کہاں تک اے دلِ مضطر فریب تابِ سکوت
الجھ پڑے گی نظر سے زباں کبھی نہ کبھی

فراق و درد و غمِ عشق سے حذر کب تک
وہ چل ہی دیں گے لبِ کارواں کبھی نہ کبھی

غرورِ تیز روی سے نہ مطمئن ہو بشر
رکے گا تو سنِ عمرِ رواں کبھی نہ کبھی

یقین ہے کہ بنیا ہو ں سے تنگ آ کر
کریں گے پرسشِ دردِ نہاں کبھی نہ کبھی

نہ آئے حرف کہیں ترکِ آرزو پہ شکیلؔ
وہ ہوں گے مصلحتاً مہرباں کبھی نہ کبھی

غمِ عشق رہ گیا ہے غمِ جستجو میں ڈھل کر
وہ نظر سے چھپ گئے ہیں مری زندگی بدل کر

تری گفتگو کو ناصح دلِ غم زدہ سے چل کر
ابھی تک تو سن رہا تھا مگر اب سنبھل کر

نہ ملا سراغِ منزل کہیں عمر بھر کسی کو
نظر آ گئی ہے منزل کہیں دو قدم ہی چل کر

غمِ عمرِ مختصر سے ابھی بے خبر ہیں کلیاں
نہ چمن میں پھینک دینا کسی پھول کو مسل کر

ہیں کسی کے منتظر ہم مگر اے امیدِ مبہم
کہیں وقت رہ نہ جائے یونہی کروٹیں بدل کر

مرے دل کو راس آیا نہ جمودِ غیر فانی
ملی راہِ زندگانی مجھے خلد سے نکل کر

مری تیز گامیوں سے نہیں برق کو بھی نسبت
کہیں کھو نہ جائے دنیا مرے ساتھ ساتھ چل کر

کبھی یک بہ یک توجہ کبھی دفعتاً تغافل
مجھے آزما رہا ہے کوئی رخ بدل بدل کر

ہیں شکیلؔ زندگی میں یہ جو وسعتیں نمایاں
انھیں وسعتوں سے پیدا کوئی عالم غزل کر

ہر جذبۂ غم کی تلخی میں اک مستی پنہاں دیکھیں گے
جو گردشِ ساغر دیکھ چکے کیا گردشِ دوراں دیکھیں گے

ہر بار ہماری جانب سے تجدید محبت کیا معنی
اک دن تری نیچی نظروں کو خود سلسلہ جنباں دیکھیں گے

سمجھے تھے کہ نوائے پردہ نشیں ادراک و یقیں کی حد میں نہیں
لیکن یہ خبر کیا تھی کہ تجھے نزدیک رگ جاں دیکھیں گے

اے ہم نفسو مایوس نہ ہو ٹوٹا وہ طلسم قید قفس
اک بار ذرا پھر مل جل کر کہدو کہ گلستاں دیکھیں گے

محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے دنیا کو سمجھ کر رشک ارم
جیسے کوئی مجھ سے کہتا ہو پھر لغزش انساں دیکھیں گے

ہے خواہش لطف بے پایاں لیکن یہ کوئی ان سے کہدے
تکمیل طلب منظور نہیں ہم وسعت داماں دیکھیں گے

سب رونق گلشن خاک ہوئی سلکین نہ گئی پھولوں کی ہنسی

شاید ہے انھیں یہ خوش فہمی پھر فصلِ بہاراں دیکھیں گے

ہے ان کو طلب منظور تو دل ہر جلوہ کا مسکن بن جائے
اس گھر کو وہ اپنا سمجھیں گے جب گھر میں چراغاں دیکھیں گے

تجدید وفا کے سائے میں نیند آہی گئی دیوانوں کو
محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے پھر خواب پریشاں دیکھیں گے

آجائے شکیبؔ اک بار کوئی ہر سمت ہے اگر برہم ہی سہی
ہستی کے شکستہ ساز پہ ہم فطرت کو غزل خواں دیکھیں گے

ممکن نہیں کہ دور رہیں راہ وفا سے ہم
بہکے بھی گر کبھی تو انھیں کی رضا سے ہم

پھیکا سا ہو چلا ہے کچھ افسانہ حیات
آؤ کہ اس میں رنگ بھریں ابتدا سے ہم

اللہ رے اپنے شوق کی طوفاں پسندیاں
ساحل پہ آ کے روٹھ گئے ناخدا سے ہم

یہ عشق یہ بلندی عرفاں تو دیکھنا
راہ حیات پوچھ رہے ہیں قضا سے ہم

بے اختیار مانگ لی تیرے ستم کی خیر
شرمندہ ہو کے رہ گئے دستِ دعا سے ہم
اے خود فریبیٔ دلِ ناداں ترے نثار
تشبیہ دے رہے ہیں جفا کو وفا سے ہم
کن منزلوں میں ہے خلشِ انتظارِ دوست
اکثر تو چونک اٹھے ہیں خود اپنی صدا سے ہم
ان کی ندامتوں نے سہارا دیا شکیلؔ
ڈرنے لگے تھے اپنی جرأتِ بے مدعا سے ہم

بے خودی ہے نہ ہوشیاری ہے
بادہ خواری سی بادہ خواری ہے
حسن مصروفِ پردہ داری ہے
جانے اب کس نظر کی باری ہے
تو نے دیکھی تو ہوگی اے ناصح!
وہ محبت جو اختیاری ہے
کم نہیں شورشِ نفس لیکن

زندگی پر جمود طاری ہے
غمِ الفت تو دل سے ہار چکا
اب غمِ زندگی کی باری ہے
جس چمن میں کبھی نہ آئے بہار
اس چمن کی خزاں ہی پیاری ہے
ہائے وہ بادہ کش کہ جس نے فقیل
زندگی بے پئے گذاری ہے

مآلِ گردشِ دوراں وہ کیا سمجھے وہ کیا جانے
سنے ہوں عمر بھر جس نے گل و بلبل کے افسانے
دکھائیں بندگی عشق کا عالم جو دیوانے
حرم میں حشر برپا ہو لرز جائیں صنم خانے
مری کوتاہ فہمی میری گمنامی کا باعث ہے
جو میں دنیا کو پہچانوں تو دنیا مجھ کو پہچانے
رہ عشق و وفا میں ہے طلب کی وہ کٹھن اک منزل
جہاں سے بے نیازانہ گذر جاتے ہیں دیوانے

ہوا جاتا ہے کم ذوقِ وفا دورِ ترقی میں
کہ اب جلتے نہیں بے ہوش ہو جاتے ہیں پروانے
محبت آرزو ، سعئ مسلسل ، ذوقِ محرومی
متاعِ زندگی میں بس یہی دو چار افسانے

اب تک نشاطِ نیں ہیں دل نصیب سے
اک دن کسی کو دیکھ لیا تھا قریب سے
اکثر بہ زعم ترکِ محبت خدا گواہ
گذرا چلا گیا ہوں دیارِ حبیب سے
دستِ خزاں نے بڑھ کے وہیں اس کو چن لیا
جو پھول گر گیا نگہ عندلیب سے
اہلِ سکوں سے کھیل نہ اے موجِ انبساط
اک دن الجھ کے دیکھ کسی غم نصیب سے
تا اہلِ ناز کو بھی ملے فرصتِ نیاز
میں دور ہٹ گیا جو وہ گذرے قریب سے
یہ کس خطا پہ روٹھ گئی چشمِ التفات

یہ کب کا انتقام لیا مجھ غریب سے
ان کے بغیر بھی ہے وہی زندگی کا دور
حالاتِ زندگی ہیں مگر کچھ عجیب سے
سمجھے ہوئے تھے حسنِ ازل جس کو ہم شکیلؔ
اپنا ہی عکسِ رخ نظر آیا قریب سے

بے اثر دورِ جام ہے اب تک
زندگی تلخ کام ہے اب تک
نارسا ہر پیام ہے اب تک
پست ذوقِ عوام ہے اب تک
مہرِ ناباں سے کھیلنے والو
میری دنیا سرِ شام ہے اب تک
پینے والے تو کب کے پی بھی گئے
میرے ہاتھوں میں جام ہے اب تک
محبت بے اثر سہی لیکن؛
قابلِ احترام ہے اب تک

گفتگو ان سے لاکھ بار ہوئی
آرزوئے کلام ہے اب تک
تلخیٔ غم کی دل کو تاب نہیں
مے کشی کیوں حرام ہے اب تک
وائے رجعت پسندیٔ رنداں
قید ظرف و مقام ہے اب تک

شب کی بہار صبح کی ندرت نہ پوچھئے
کتنا حسین ہے خواب محبت نہ پوچھئے
پھولوں کی غم رسیدہ مسرت نہ پوچھئے
ظاہر ہیں خندہ زن ہیں حقیقت نہ پوچھئے
وہ دن گئے کہ تھی مجھے پرسش کی آرزو
مجبور ہوگئے اب مری حالت نہ پوچھئے
ہاتھوں سے دل کے چھوٹ گیا دامن امید
کیا مل گیا جواب شکایت نہ پوچھئے
دل کو نہ ہو گی تاب غم بے توجہی

للّٰہ داستانِ محبت نہ پوچھیے!
یوں دیکھتے ہیں جیسے ادھر دیکھتے نہیں
اس لطفِ بے طلب کی نزاکت نہ پوچھیے

گلشن ہو پھر تصرفِ دورِ خزاں سے دور
یہ مرحلہ نہیں مرے عزمِ جواں سے دور
ہو کیوں حدیثِ دردِ محبت زباں سے دور
رہتا ہے رازِ دل بھی کہیں رازداں سے دور
جائے کوئی کہاں درِ میخانہ چھوڑ کر
خلدِ بریں ہے جنتِ اربابِ جاں سے دور
تفریقِ رہروانِ محبت تو دیکھئے
کچھ کارواں کے ساتھ ہیں کچھ کارواں سے دور
ذوقِ جفا کو نخوتِ حسن قبول ہے
شاید کہ اب زمیں نہ رہی آسماں سے دور
اے دل خیالِ ترکِ تمنا بجا سہی
لیکن یہاں کی بات نہ جائے یہاں سے دور

مجبوری مسرت بے کیف کی قسم
فصلِ بہار رہ نہ سکے گی خزاں سے دور
فانیؔ سے شعر سن کے شکیلؔ اس زمین میں
ذوقِ سخن ہے جرأت عرضِ بیاں سے دور

ہوں دل میں عشرت غمِ جاناں لئے ہوئے
صحرا ہے رنگ و بوئے گلستاں لئے ہوئے
ذوقِ گناہ و عزمِ پشیماں لئے ہوئے
کیا کیا ہنر ہیں حضرتِ انساں لئے ہوئے
کفر و خرد کو راس نہ آئے گی زندگی
جب تک جنوں ہے مشعل ایماں لئے ہوئے
ہوں ان کے سامنے مگر ان پر نظر نہیں
سعئ طلب ہے عزمِ گریزاں لئے ہوئے
دل کو سکون پستئ ساحل سے کیا غرض
ہر عزم ہے بلندئ طوفاں لئے ہوئے
گلشن کے دل میں آج بھی محفوظ ہیں وہ پھول

مرجھا گئے جو داغِ بہاراں لئے ہوئے

آ ہی گئے وہ عرضِ ندامت کو اے شکیلؔ

لعلیں لبوں پہ خندۂ گریاں لئے ہوئے

لطفِ نگاہِ ناز کی تہمت اٹھائے کون!

کچھ دیر کی بہار کو خاطر میں لائے کون

دل چیز کیا ہے دل سے محبت جتائے کون

اپنا جو خود نہ ہوا سے اپنا بنائے کون!

تیرے حضور تجھ سے خفا ہو کے جائے کون

زخمِ دلِ تباہ پہ نشتر لگائے کون

مانا کہ حریمِ ناز کے پردوں میں ہے کوئی

لیکن حریمِ ناز کے پردے اٹھائے کون

ہاں ہاں مجھے تمہارے تغافل کا غم نہیں

اس دورِ خود روی میں کسے آزمائے کون

پڑ جائے لاکھ وقت مگر یہ نہیں قبول!

میں دیکھتا رہوں کہ مرے کام آئے کون

کیسی بہار کس کے ستارے ، کہاں کے پھول
جب تم نہیں تو دیدۂ و دل میں سمائے کون
ذوقِ عمل نہ ذوقِ جنوں ہر طرف سکوں
جنت اگر یہی ہے تو جنت میں جائے کون
محفل میں کوئی سوختہ جاں ہی نہیں شکیلؔ
سوز و گداز شمع پہ آنسو بہائے کون

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگر کہاں
حسنِ ازل تو عام ہے حسنِ نظر کہاں
تیرے حضور وسعتِ قلب و نظر کہاں
جو تجھ میں کھو گیا اسے اپنی خبر کہاں
غم روحِ زندگی ہے تو غم سے مفر کہاں
جائے گا زندگی سے کوئی روٹھ کر کہاں
بے مصلحت گذار نہ عالم شباب کا
اے وقت ناشناس یہ دن عمر بھر کہاں
جلوے سما ہی جائیں گے آئے تو کوئے دوست

دامن سے بچ کے جائے گی گردِ سفر کہاں

زاہد کی برہمی کا اثر لیں نہ بادہ خوار
جذبات مشتعل ہوں تو فکر و نظر کہاں

ہر چند آندھیوں کی ہیں گلشن میں یورشیں
لیکن ابھی شکست نسیم سحر کہاں

مانا کہ حسن آہ سے ہوتا ہے بے قرار
لیکن کسی کی آہ میں اتنا اثر کہاں

اک روز میں تو ڈھونڈھ ہی لوں گا جہان نو
دنیا مجھے تلاش کرے گی مگر کہاں

ہر لحظہ نا تمام ہے روداد غم شکیلؔ
اہلِ نظر کو فرصتِ نقد و نظر کہاں

فطرت کے حسین نظاروں میں پر کیف خزانے اور بھی ہیں
میخانہ اگر ویراں ہے تو کیا رندوں کے ٹھکانے اور بھی ہیں
آغاز جفا کی تلخی سے گھبرا نہ دل آزار طلب
یہ وقت یہیں پر ختم نہیں کچھ تلخ زمانے اور بھی ہیں

لمحات حسین پرسشِ غم محدود نہیں تا شکرِ کرم
بے لفظ سہی بے نام سہی ہونٹوں کے فسانے اور بھی ہیں
جینا ہے تجھے پینے کے لئے اے دوست کسی عنوان سے پی
جینے کا بہانہ ایک سہی پینے کے بہانے اور بھی ہیں
غنچوں کے چٹکنے پر ہی نہیں موقوف توجہ اہلِ چمن
کچھ نیم شگفتہ ہونٹوں پر خاموش ترانے اور بھی ہیں
یہ جلوہ گہہِ فطرت ہی نہیں اربابِ جہاں کا عکس حسیں
اس جلوہ گہہ فطرت کے سوا کچھ آئینہ خانے اور بھی ہیں
یہ عجلت بے جا خوب نہیں رک جائیے تو سہی سنئیے تو سہی
کچھ دل کی کہانی اور بھی ہے کچھ غم کے فسانے اور بھی ہیں
ہر تیر نظر کی جنبش میں پاتا ہوں تشکیلِ انداز جنوں
معدوم ہے اب تک جن کا نشاں وہ تیر نشانے اور بھی ہیں

نہ کھو اے رہبرِ منزل وقارِ فیضِ عام اپنا
جنھیں کچھ فکر ہو گی ڈھونڈ ہی لیں گے مقام اپنا
بہار میکدہ اپنی، سرِ گلشن بنام اپنا

مگر کچھ اس طرح جیسے نہ بھول اپنے نہ جام اپنا

نمودِ صبح فرقت کی حقیقت پوچھنے والو
الم سے تنگ آکر رخ بدل لیتی ہے شام اپنا

زباں کو اذنِ گویائی نہ کچھ دل کی پذیرائی
یہی آدابِ محفل ہیں تو محفل کو سلام اپنا

خراباتِ جہاں میں تہمتِ بیگانگی کب تک
ارے او ذہنِ خوابیدہ مٹا جاتا ہے نام اپنا

اسیرانِ قفس سے بے رخی تکذیبِ ایماں ہے
کوئی اربابِ گلشن تک، یہ پہنچا دے پیام اپنا

شکیلؔ اس دور کے مغرب زدہ فنکار سے کہدو
زمانے کو پلٹ دے گا یہی رنگِ کلام اپنا

نگاہوں کو کہاں تابِ حضوری
قرینِ مصلحت ہے ان سے دوری

نہ چھیڑ او بے وفا ذکرِ تغافل
کہانی پھر نہ رہ جائے ادھوری

مقاماتِ جنوں سے بے خبر ہے
ارے توبہ خرد کی بے شعوری
بقدرِ اعتبارِ دیدہ و دل
ترے جلووں سے قربت ہے، نہ دوری
محبت ساتھ دیتی ہے نفس کا
مگر جب تک تمنّا ہو نہ پوری
وہاں قیدِ سکوت و شرطِ آداب
یہاں ہونٹوں پہ احوالِ ضروری
شکیلؔ آ ہی گئے وہ دل گرفتہ!
مجھے راس آئی دل کی ناصبوری!

آنکھوں سے دور صبح کے تارے گئے
نیند آ گئی تو غم کے نظارے چلے گئے
دل تنہا کسی کی یاد میں مصروف اور ہم
شیشے میں زندگی کو اتارے چلے گئے
اللہ ری بیخودی، کہ ہم ان کے ہی روبرو

بے اختیار انھیں کو پکارے چلے گئے

مشکل تھا کچھ تو عشق کی بازی کا جیتنا
کچھ جیتنے کے خوف سے ہارے چلے گئے

ناکامیٔ حیات کا کرتے بھی کیا گلہ
دو دن گزارنا تھے گذارے چلے گئے

ترغیب ترک شوق کے پردے میں غمگسار
ہر نقش آرزو کو ابھارے چلے گئے

پہنچا ئی کس نے دعوتِ مے اہلِ زہد تک
شاید تری نظر کے اشارے چلے گئے

وہ دل حریف جلوۂ فردوس بن گیا
جس دل میں تیرے غم کے شرارے چلے گئے

ان کے بغیر زیست بہر حال زیست تھی
جیسی گذر رہی تھی گذارے چلے گئے

جلوے کہاں جو ذوق تماشہ نہیں شکیلؔ
نظریں چلی گئیں تو نظارے چلے گئے

ایک ایک قدم فریب تمنّا سے بچ کے چل؛
دنیا کی آرزو ہے تو دنیا سے بچ کے چل
خود ڈھونڈ لے گا تجھ کو ترا منفرد مقام
راہ طلب میں نقش کفِ پا سے بچ کے چل
باقی ہے مرے دل میں ابھی عظمتِ وجود
قطرے سے کہہ رہا ہوں کہ دریا سے بچ کے چل
ملتی نہیں راہ سکوں خوفِ یاس میں
گلشن کی جستجو ہے تو صحرا سے بچ کے چل
منھ جادۂ وفا سے نہ موڑ اے وفا شعار
لیکن حدودِ چشم تماشا سے بچ کے چل
کتنی حسیں ہیں ان کے ستم کی شکائتیں
شکر کرم کی زحمت بے جا سے بچ کے چل
لمحے اداس اداس فضائیں گھٹی گھٹی
دنیا اگر یہی ہے دنیا سے بچ کے چل
اپنے ادب پہ ناز ہے تجھ کو اگر شکیلؔ
مغرب زدہ ادیب کی دنیا سے بچ کے چل

وقتِ سحر خوشی کا مزہ غم میں آگیا
ہر پھول ہنس کے دامنِ شبنم میں آگیا

بے فصلِ گل ہی بارِ تھی ناصح کی گفتگو
ظالم کہاں بہار کے موسم میں آگیا

اے زندگی کتابِ ازل کا ورق الٹ
انساں فریبِ لغزشِ آدم میں آگیا

اب شغلِ مے ہے تیری طبیعت پہ منحصر
واعظ یہی بہت ہے کہ تو ہم میں آگیا

مرہونِ دستِ ناز نہیں جامِ آرزو
یہ جام خود ہی گردشِ پیہم میں آگیا

جب دل کو مل سکی نہ غمِ دہر سے نجات
گھبرا کے حسن و عشق کے عالم میں آگیا

کچھ شاد تھے وہ اپنے غرورِ جفا پہ آج
کچھ لطف میرے شکوۂ پیہم میں آگیا

تھی تیرے غم سے ہٹ کے تلاشِ سکونِ دل
لیکن سکونِ دل بھی ترے غم میں آگیا

ہٹ کر کسی کی بارگہہ ناز سے شکیلؔ
محسوس یہ ہوا کہ جہنم میں آ گیا

لب خزاں نہ سہی غیرت بہار کرے
کوئی تو شکوۂ آلام روزگار کرے
غم حیات سے دل کو ابھی نجات نہیں!
نگاہِ ناز سے کہہ دو کہ انتظار کرے
کہاں مسرتِ باطل کہاں حقیقتِ غم
خزاں کا ذکر نہ آوارۂ بہار کرے
ہیں اس کے ہوش جنوں پرور بہ جان ودل صدقے
ہنسی ہنسی میں جو دامن کو تار تار کرے
بدل ہی جاتے ہیں ماحول زندگی اکثر
مقدر اس کا خدا جس کو سازگار کرے
شریک سازشِ حرماں خزاں سہی لیکن
اگر یہ جرم خزاں کی جگہ بہار کرے

غمِ خزاں ہی سے فرصت نہیں یہاں تو شکیلؔ
جسے سکوں ہو وہ نظارۂ بہار کرے

کیوں غمِ عشرت میں دل کو صرفِ ماتم کیجیے
غم ہی قسمت ہے تو شکرِ عشرتِ غم کیجیے

یا مرے ذوقِ وفا کو دیجئے اذنِ شکست
یا غرورِ بے نیازی اور محکم کیجیے

ہو چلا ہے زندگی کا شادکامی پر غرور
اب توجہ کی نظر پہلے سے کچھ کم کیجیے

ہے اگر منظور تعمیلِ تقاضائے جنوں
چاک نظروں سے گریبانِ دو عالم کیجیے

کم سے کم اتنے تو آنسو ہوں کہ ہستی ڈوب جائے
"گریہ" لازم ہے تو کیوں تقلیدِ شبنم کیجیے

ہجر کی تنہائیوں میں کیسی شب کس کی سحر
زندگی کو بے نیازِ ہر دو عالم کیجیے

شکوہ ہائے جور پر بولے وہ شرما کر شکیلؔ
اپنے افسانے کے اس ٹکڑے کو مبہم کیجئے

بیکسی سے مرنے والے کا بھرم رہ جائے گا
وہ ضرور آئیں گے جب آنکھوں میں دم رہ جائے گا
کیا خوشی میں زندگی کا ہوش کم رہ جائے گا
غم اگر مٹ بھی گیا احساسِ غم رہ جائے گا
ہائے وہ اک عالم بیتابیٔ پنہاں کہ جب
فاصلہ منزل سے اپنا دو قدم رہ جائے گا
چھیڑ دی میں نے اگر رودادِ حسنِ شش جہت
نامکمل قصۂ دیر و حرم رہ جائے گا

گلشن ہو نگاہوں میں تو جنت نہ سمجھنا
دم بھر کی عنایت کو محبت نہ سمجھنا
کیا شے ہے متاعِ غم و راحت نہ سمجھنا!
جینا ہے تو جینے کی حقیقت نہ سمجھنا

ہو خیر ترے غم کی کہ ہم نے ترے غم سے
سیکھا ہے مسرت کو مسرت نہ سمجھنا
نسبت ہی نہیں کوئی محبت کو خرد سے
اے دل کبھی مفہوم محبت نہ سمجھنا
یہ کس نے کہا تم سے کہ روداد وفا کو
سن کر بھی سمجھنے کی ضرورت نہ سمجھنا
ویرانیٔ ماحول کو بربادیٔ دل کو
ہر دور میں آثار محبت نہ سمجھنا
سر خم ہو اگر مصلحت وقت کے آگے
اس جبر مسلسل کو عبادت نہ سمجھنا
دیکھے جو تمھیں کوئی محبت کی نظر سے
للہ شکیلؔ اس کو محبت نہ سمجھنا

زندگی سے کے ارباب جاں چل دیئے
راہ سونی ہوئی کارواں چل دیئے
بن کے آئے سراپا حقیقت مگر

دیکھ کر چند خوابِ گراں چل دیئے

کہتے آئے تھے محفل میں اک داستاں

بن کے عنوانِ ہر داستاں چل دیئے

بعد ترکِ محبت ہم ان کی طرف

جانے والے نہ تھے ناگہاں چل دیئے

کب اٹھایا بارِ ہستی کہ اہلِ جنوں

ناتواں آئے تھے ناتواں چل دیئے

اے شکیلؔ ان کی محفل سے جاتے تو ہو

اور اگر دل نے پوچھا کہاں چل دیئے

تری محفل سے اٹھ کر عشق کے ماروں پہ کیا گذری

مخالف اک جہاں تھا جانے بیچاروں پہ کیا گذری

سحر کو رخصتِ بیمارِ فرقت دیکھنے والو

کسی نے یہ بھی دیکھا رات بھر تاروں پہ کیا گذری

سنا ہے زندگی ویرانیوں نے لوٹ لی مل کر

نہ جانے زندگی کے ناز برداروں پہ کیا گذری

ہنسی آئی تو ہے بے کیف سی لیکن خدا جانے
مجھے مسرور پا کر میرے غم خواروں پہ کیا گذری
اسیرِ غم تو جاں دے کر رہائی پا گیا لیکن!
کسی کو کیا خبر زنداں کی دیواروں پر کیا گذری
یہ زاہد ہیں انھیں کیا تجربہ اعجاز رحمت کا
یہ جنت میں بھی پوچھیں گے گنہگاروں پہ کیا گذری

نقشِ فطرت نے جو ابھارے ہیں
کچھ کنائے ہیں کچھ اشارے ہیں
ہم سے پوچھو بہار جلوۂ دوست
ہم نے فرقت کے دن گذارے ہیں
رونقِ چمن رخ دیکھنے والو!!
کچھ زمیں پر بھی چاند تارے ہیں
تم زمانے کے ہو ہمارے سوا
ہم کسی کے نہیں تمہارے ہیں
ہم سے زندہ تھی زندگی کل تک

آج ہم زندگی کے مارے ہیں
جب نظارے نہ تھے نگاہیں تھیں
اب نگاہیں نہیں نظارے ہیں
گو نہیں کوئی ربط و ضبط مگر
تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
دیکھ کر ہاتھ ڈالنا گل چیں
اب یہ غنچے نہیں شرارے ہیں
جن کو آنسو سمجھ رہے ہو شکیلؔ
دل کے ٹوٹے ہوئے سہارے ہیں

خراماں زندگی ہے والہانہ!
ذرا آگے سے ہٹ جائے زمانہ
ہزاروں بار ملنے پر بھی اب تک
تعارف ہے کسی سے غائبانہ
چمن پر بجلیاں منڈلا رہی ہیں
کہاں لے جاؤں شاخ آشیانہ

محبت کرنے والے ہیں ہزاروں
ہمیں سے کیوں الجھتا ہے زمانہ
ازل سے لٹ رہی ہے دولت غم
مگر خالی نہیں ہوتا خزانہ
میں خود ہی بجلیاں گرنے سے پہلے
جلا دیتا ہوں اکثر آشیانہ
اجازت ہو تو اے ارباب محفل
کروں کچھ شکوۂ رنگ زمانہ
بظاہر لطف بھی مہر و وفا بھی
پس پردہ یہ سب کچھ تاجرانہ
شکیلؔ ان کشمکش کی ساعتوں میں
غزل کیسے کہوں میں عاشقانہ

ملا نہ رہروانِ سست گام کو نشاں
نظر نظر میں رہ گئی الجھ کے گرد کارواں
نیا جمال منکشف سر مکان و لا مکاں

مری نگاہ مضطرب کبھی یہاں کبھی وہاں
خیالِ آرزو میں گم ، نگاہ جستجو میں گم

فریبِ چشم و دل میں سب یقین و آگہی کہاں
ہو جس کو تابِ ضبطِ غم وہ دل کہاں سے لاؤں میں

نفس نفس یہ مرحلے قدم قدم یہ امتحاں
یہ عزم بال و پر لئے چمن میں پھر رہا ہے کون

نہ خوفِ برق و باد ہے نہ فکرِ سوزِ آشیاں
نوازشوں کی حد ہوئی کرم کی انتہا ہوئی

نہ میں کسی پہ ملتفت نہ کوئی مجھ پہ مہرباں
جنوں پہ ہو کے طعنہ زن خرد نے کچھ کہا مگر

میں اپنی منزلوں کی سمت چل دیا رواں دواں
ترا جمالِ دل نشیں چراغِ بزمِ رنگ و بو

مگر یہ کیا ہے مصلحت کہیں عیاں کہیں نہاں
اٹھا قدم اٹھا شکیلؔ دیکھ سامنے
وہ اڑ رہی ہے گرد سی وہ جا رہا ہے کارواں

راہ خدا میں عالم رندانہ مل گیا
مسجد کو ڈھونڈھتے تھے کہ میخانہ مل گیا

آغاز کائنات سے جس کی تلاش تھی!
اوراق زندگی میں وہ افسانہ مل گیا

اہل جنوں کو تاب کہاں سوز حسن کی
جلتے ہی شمع خاک میں پروانہ مل گیا

تنہا چمن میں آکے بھٹکتی تھی کیا بہار
اچھا ہوا کہ راہ میں دیوانہ مل گیا

ہم نے خودی سے کام لیا وہ بھی بچھ گئے
دنیا کو چاہیے تھا اک افسانہ مل گیا

دیکھا نگاہ یاس سے جب گل کدے کا رنگ
ہر گل کی آڑ میں کوئی ویرانہ مل گیا

ٹھکرا کے مرگ شوق کا عالم دل حزیں
ارباب زندگی سے حریفانہ مل گیا

اک اک زبان پر مری روداد ہے شکیلؔ
اپنوں کے ساتھ کیا کوئی بیگانہ مل گیا

نظر نواز نظاروں میں جی نہیں لگتا
وہ کیا گئے کہ بہاروں میں جی نہیں لگتا
شب فراق کو اے چاند آ کے چمکا دے
نظر اداس ہے تاروں میں جی نہیں لگتا
غم حیات کے مارے تو ہم بھی ہیں لیکن
غم حیات کے ماروں میں جی نہیں لگتا
نہ پوچھ مجھ سے ترے غم میں کیا گزرتی ہے
یہی کہوں گا ہزاروں میں جی نہیں لگتا
کچھ اس قدر ہے غم زندگی سے دل مایوس
خزاں گئی تو بہاروں میں جی نہیں لگتا
فسانۂ شب غم ختم ہونے والا ہے
شکیل چاند ستاروں میں جی نہیں لگتا

اللہ اللہ مآل نظم کہن
زندگی زندگی کی ہے دشمن
ہے خزاں آج کل حریف چمن

ہے جنوں ان دلوں تہی دامن
کیا خبر تھی بہار میں اب کے
چاک ہوں گے دلوں کے پیراہن
وائے بے مائیگیٔ فکر و نظر
ہے سخن سے جدا مذاقِ سخن
خونِ انسانیت کے پیاسوں نے
نام صحرا کا رکھ دیا ہے چمن
پھر دلوں میں نئی امنگ اٹھی
لے کے عزمِ شکستِ کوہ و دمن
زندگی کی شکستہ حالی پر
رو رہی ہے شکیلؔ عظمتِ فن

ان کی صورت ان کے جلوے ان کی محفل دیکھ کر
رہ گئے ہم حیرتِ آئینۂ دل دیکھ کر
آج ملتے ہی نگاہیں کچھ وہ شرما سے گئے
جانے کیا سمجھے مری بیتابیٔ دل دیکھ کر

شاید اہل کارواں کے حوصلے بیدار ہیں
کیوں قدم اٹھتے نہیں آثار منزل دیکھ کر
دیکھنا چاہو اگر تم اپنی معراج ستم
مسکرا دینا مری بربادیٔ دل دیکھکر
اپنی خودداری پہ ان کو ہائے کتنا ناز تھا
ہوش کھو بیٹھے ہیں مدِّ مقابل دیکھ کر
سننے والے سیکڑوں ہیں ہم نوا کوئی نہیں
دوست دل کی بات کہتا رنگ محفل دیکھ کر
فرق ذرہ بھر نہ پایا ہم نے دونوں میں شکیلؔ
اک نظر ان پر بھی ڈالی ماہ کامل دیکھ کر

ترے بغیر عجب بزم دل کا عالم ہے
چراغ سیکڑوں جلتے ہیں روشنی کم ہے
جو جی رہے ہیں انھیں کے لیے ہر اک غم ہے
زہے نصیب کہ پھولوں کی زندگی کم ہے
قفس سے آئے چمن میں تو بس یہی دیکھا

بہار کہتے ہیں جس کو خزاں کا عالم ہے
خیال ترک محبت کی خیر ہو یا رب
آج کچھ مست نگاہوں کی بے رخی کم ہے
بنائے ہیں اسی شبنم نے سینکڑوں دریا
نہیں ملال جو دریا حریف شبنم ہے
کہا یہ دل نے سنی گفتگو جو ناصح کی
مبالغہ ہے بہت اس میں واقعہ کم ہے
بہار آئے چمن میں یہ انتظار نہ دیکھ
شکیلؔ اپنے جنوں کی بہار کیا کم ہے

وہ کیفِ حسن و عشق وہ لطفِ غزل گیا
ذوقِ سلیم رو کہ زمانہ بدل گیا
جس بزم میں سنی تھی محبت کی داستاں
اس بزم کا خیال ہی دل سے نکل گیا
میں نے ہی زندگی میں بھرا تھا خوشی کا رنگ
جادو مجھی پہ گردشِ دوراں کا چل گیا

گذری ہوئی بہار کو اب اور کیا کہوں
اک لمحۂ فریب تھا جو آکے ٹل گیا
اے مہرِ صبح اپنی شعاعوں کو پھونک دے
جس دن پہ مجھ کو ناز تھا وہ دن ہی ڈھل گیا
اب امتحانِ تیز خرامی ہے اور ہم
لو کارواں تو حدِّ نظر سے نکل گیا

جس قدر دل بسمل ناز و ادا بنتا گیا
باعثِ دلچسپی اہلِ وفا بنتا گیا
زندگی ممنونِ احساں ہی رہی ان کے حضور
لب تک آ آ کر ہر اک نالہ دعا بنتا گیا
ایک مرکز پر رہی قائم یہ بزمِ کائنات
نقش ہستی اک مٹا اور دوسرا بنتا گیا
میں نے چھیڑا تھا کبھی سازِ شعورِ زندگی
جب سے ہر نغمہ مرے دل کی صدا بنتا گیا

بے سہارا دیکھ کر کشتی خدا پر چھوڑ دی
اور میں اپنی نظر میں ناخدا بنتا گیا

آدمی نہ اتنا بھی دور ہو زمانے سے
صبح کو جدا سمجھے شام کے فسانے سے

دیکھ طفلک ناداں قدر کر بزرگوں کی
گتھیاں نہ سلجھیں گی مضحکہ اڑانے سے

زخم سر کے دیوانے زخم دل کا قائل ہو
زندگی سنورتی ہے دل پہ چوٹ کھانے سے

مطرب جنوں ساماں تو نہ چھیڑ یہ نغمہ
دھن خراب ہوتی ہے تیرے گنگنانے سے

گرمیٔ سخن سے کچھ کام بن نہیں سکتا
مل ہی جائے گی منزل دو قدم بڑھانے سے

کہیں عشق کا تقاضہ کہیں حسن کے اشارے
نہ بچا سکیں کے دامن غم زندگی کے مارے

شبِ غم کی تیرگی میں مری آہ کے شرارے
کبھی بن گئے ہیں آنسو، کبھی بن گئے ہیں تارے
نہ خلش رہی وہ مجھ میں نہ کشش رہی وہ تجھ میں
جسے زعمِ عاشقی ہو وہی اب تجھے پکارے
جنھیں ہو سکا نہ حاصل کبھی کیفِ قربِ منزل
وہی دو قدم ہیں مجھ کو تری جستجو سے پیارے
میں شکیلؔ ان کا ہو کر بھی نہ پا سکا ہوں ان کو
مری طرح زندگی میں کوئی جیت کر نہ ہارے

متاعِ غمِ عاشقی مانگ لوں گا
تمھیں سے تمھاری خوشی مانگ لوں گا
دمِ نزع بالیں پہ آئے اگر تم
خدا سے نئی زندگی مانگ لوں گا
شبِ غم چھپا ماہِ کامل تو کیا غم
ستاروں سے کچھ روشنی مانگ لوں گا
تمھیں اک نہیں حسن والے ہیں لاکھوں

کسی چاند سے چاندنی مانگ لوں گا

جو از خود نہ بدلا نظام دو عالم

تری زلف سے برہمی مانگ لوں گا

بدلے بدلے مرے غمخوار نظر آتے ہیں

مرحلے عشق کے دشوار نظر آتے ہیں

کشتی غیرت و احساس سلامت یارب

آج طوفان کے آثار نظر آتے ہیں

انقلاب آیا نہ جانے یہ چمن میں کیسا

غنچہ و گل مجھے تلوار نظر آتے ہیں

جن کی آنکھوں میں جھلکتا تھا کبھی رنگ خلوص

ان دنوں مائل پندار نظر آتے ہیں

جو سنا کرتے تھے ہنس ہنس کے مرا نغمۂ شوق

اب مری شکل سے بیزار نظر آتے ہیں

ان کے آگے جو جھکی رہتی ہیں نظریں اپنی

اس لئے ہم ہی خطا وار نظر آتے ہیں

دشمنِ خوئے وفا رسمِ محبت کے حریف
وہ ہی کیا اور بھی دو چار نظر آتے ہیں
جنسِ نایاب محبّت کی خدا خیر کرے
بوالہوس اس کے خریدار نظر آتے ہیں
وقت کو پوجنے والے ہیں پجاری ان کے
کوئی مطلب ہو تو غمخوار نظر آتے ہیں
جائزہ دل کا اگر لو تو وفا سے خالی
شکل دیکھو تو نمک خوار نظر آتے ہیں
روزِ روشن میں اگر ان کو دکھاؤ تارے
وہ یہ کہہ دیں گے کہ سرکار نظر آتے ہیں
ہم نہ بدلے تھے نہ بدلے ہیں نہ بدلیں گے شکیلؔ
ایک ہی رنگ میں ہر بار نظر آتے ہیں

شوخ نظروں میں جو شامل برہمی ہو جائے گی
اور بھی جنسِ محبت قیمتی ہو جائے گی

آنکھوں آنکھوں میں جو صلح باہمی ہو جائے گی
بات بھی رہ جائے گی اور بات بھی ہو جائے گی

دل نظر بن جائے گا غم ہر خوشی ہو جائے گی
آپ کے جاتے ہی دنیا دوسری ہو جائے گی

آئینہ کر دے گی میری خود فراموشی مجھے
بے خودی جب حد سے گذرے گی خودی ہو جائے گی

داغِ دل بنجائے گا فرقت میں رشکِ مہر و ماہ
یوں بھی میرے غم کدے میں روشنی ہو جائے گی

یہ تمام غنچہ و گل ہیں ہمنشیں تو مسکرائیں
کبھی یک بیک جو رو دوں تو ستارے ٹوٹ جائیں

مرے داغِ دل کی تابش جو کبھی یہ دیکھ پائیں
وہیں رشکِ بے اماں سے مہ و مہر ڈوب جائیں

کبھی ذوقِ جستجو پر اگر اعتبار کر لوں

سرِ راہ منزلیں خود مجھے ڈھونڈھنے کو آئیں
کبھی بے قرار ہو کر جو میں سازِ عشق چھیڑوں
تو یہ مشتری و زہرہ کوئی گیت پھر نہ گائیں
مرا ذوقِ مے پرستی ہے کچھ اس قدر مکمل
جو میں جامِ مے اٹھا لوں تو برس پڑیں گھٹائیں
سرِ میکدہ جو دیکھیں مری مے کشی کا منظر
ہوں شیوخ سر بہ سجدہ کریں التجائیں

دلِ غم زدہ پہ جفائیں کہاں تک
یہ دلچسپ و دل کش خطائیں کہاں تک
نہ مرنے کی فرصت نہ جینے کا یارا
ترے غم کی تہمت اٹھائیں کہاں تک
یوں ہی جائزہ دل کا لیتی رہیں گی
نگاہوں کی رنگیں شعائیں کہاں تک
نہیں بے خبر میرے نالوں سے کوئی
خدا جانے پہونچیں صدائیں کہاں تک

یہ دیکھوں مری تشنہ کامی کے غم میں
برستی رہیں گی گھٹائیں کہاں تک

عیاں کر خودی کی جھلک بندگی میں
کسی کے حضور التجائیں کہاں تک

اب آجا کہ نظریں تری جستجو میں
تخیل کے ہمراہ جائیں کہاں تک

گلستاں میں کلیوں کو مرجھانے دیجئے
مرے حال پر مسکرائیں کہاں تک

ہمیں دیکھنا ہے وہ محفل میں شمعیں
جلائیں کہاں تک بجھائیں کہاں تک

نگاہوں میں آجاؤ بے پردہ اک دن
فریب مہ و مہر کھائیں کہاں تک

انھیں بھی کچھ احساس غم ہو چلا ہے
نہ ہوں گی قبول اب دعائیں کہاں تک

یہ زورِ کلام بشکیل اللہ اللہ
مخالف بھی زور آزمائیں کہاں تک

قرباں کسی پہ دولتِ ہستی ہے آج کل
دل چیز کیا ہے جان بھی سستی ہے آج کل

نالوں کے احتجاج سے برہم ہے آسماں
اوج فلک سے آگ برستی ہے آج کل

ارض و سما نے مل کے بپا حشر کر دیا
معدوم فرقِ رفعت و پستی ہے آج کل

آغوشِ زندگی جسے کہئے وہ کائنات
اسبابِ زندگی کو ترستی ہے آج کل

خونِ حیات و نشۂ غم بے خودیٔ مرگ
رندوں میں شغلِ بادہ پرستی ہے آج کل

غنچے جھلس کے آگ ہیں شرمائے جاتے ہیں
فقرے خزاں بہار پہ کستی ہے آج کل

یارب مزاج و فطرتِ اہلِ جنوں کی خیر
ویرانیوں کی گود میں بستی ہے آج کل

ساقی بھی ہے شراب بھی لیکن نہ جانے کیوں
دل بے نیازِ شورشِ مستی ہے آج کل

جس دل میں تھی متاعِ غمِ عاشقی شکیل
اس دل میں آتشِ غمِ ہستی ہے آج کل

چھٹ گئے ہم پھر نہ مل سکیں گے شتاب
ترکِ الفت نہیں ہے ترکِ شراب

وا ہے اس وقت دیدۂ بے تاب
دیکھ اپنی تجلیوں کا جواب

حسن و تاثیرِ عشق ارے توبہ!
جیسے مرجھا کے رہ گیا ہو گلاب

ان کی نگہِ قہر سے مایوس نہ ہو دل
اک دن یہ محبت کی نظر ہو کے رہے گی

تم رازِ محبت کو چھپاتے تو ہو مجھ سے
واللہ کہ دنیا کو خبر ہو کے رہے گی

پوچھوں میں نہ کیوں ان کا پتہ اپنی نظر سے
جس سمت وہ ہوں گے یہ ادھر ہو کے رہے گی

یہ ڈوبتے تارے یہ فسردہ سا رخِ ماہ
آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

تیرا غم پاکر بلائے عشرت فانی گئی
مرحبا ذوق سکوں دل کی پریشانی گئی
زندگی جس سے عبارت تھی وہ طغیانی گئی
ہوش کیا آیا جنوں کی فتنہ سامانی گئی
آنکھ ملتے ہی کسی سے دفعتاً دل بڑھ گیا
ڈھونڈنے والے سے منزل تک نہ پہچانی گئی
ابر آیا۔ جام آیا پھول برسے لیکن آہ
زاہدانِ تنگ دل کی پاک دامانی گئی!

دانستہ سامنے سے جو وہ بے خبر گئے
دل پر ہزار طرح کے عالم گزر گئے
خودداریٔ حیات کو بدنام کر گئے
پروانے کیوں نہ جلنے سے پہلے ہی مر گئے
ہم اس لئے مقام فنا سے گذر گئے
وہ یہ کہیں نہ کہہ دیں کہ مرنے سے ڈر گئے
آوارہ گان کوئے محبت جدھر گئے
دنیا پکار اٹھی کہ غلط راہ پر گئے

روداد اہلِ بزمِ محبت نہ پوچھیے
ہنستے ہوئے جو آئے تھے با چشم تر گئے

جب تجھ کو ارتباطِ محبت پہ ناز تھا
اے زندگی بتا وہ زمانے کدھر گئے

ہر نفس ان کا خیال آتا رہا | زندگی پر پھول برساتا رہا
عشق میں ثابت قدم رہ کر بھی میں | ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا رہا
اللہ اللہ ضبطِ غم کی دولتیں | عمر بھر کھوتا رہا پاتا رہا

ان کے اک عہدِ فریب انجام سے
زندگی بھر دل کو بہلاتا رہا

جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں | کہنا جو نہ تھا وہ کہہ گیا ہوں
ہر لمحہ سرِ خوشی میں اکثر | دو اشک بہا کے رہ گیا ہوں
تھا جن پہ گماں ترے ستم کا | کچھ ایسے کرم بھی سہہ گیا ہوں
شاید وہ اسے جنوں سمجھ لیں | اک بات پتے کی کہہ گیا ہوں

اب کیا غمِ ساحل و طلاطم
اک موج کے ساتھ بہہ گیا ہوں

یکساں مری نظروں میں ہے رنگ سحر و شام
کھیلے نہ مقدر سے مرے گردشِ ایام
پیتا ہوں پلاتا ہوں وہی بادۂ کہنہ
ہر بار میں اک ڈھونڈھ کے لاتا ہوں نیا جام
ڈرتا ہوں تری برق تبسم کی چمک سے
سنتا ہوں یہ عالم بھی ہے منجملۂ اوہام

تیری محفل میں بار یابی ہے
بس یہی میری کامیابی ہے
دل کی نیرنگیاں ارے توبہ
آج زاہد ہے کل شرابی ہے
ہے شکیلؔ ایک شاعرِ فطرت
یہ نہ سمجھو تو انقلابی ہے

کیا ہوتا نہ آنکھوں کو غم ہستی میں تر ہم نے
اگر پہچان لی ہوتی زمانے کی نظر میں نے
ترا ہی عکس دیکھا صورتِ شمس و قمر میں نے
تجھی کو روبرو پایا بہ عنوانِ دگر میں نے
شب فرقت رباب یادِ رفتہ کی صدا سن کر
یکا یک کروٹیں بدلیں ادھر تم نے ادھر میں نے

نہ کعبہ میرا مرکز اور نہ بت خانہ مرا معبد
میں تجھ سے کیا کہوں ناصح جبیں رکھدی کدھر میں نے

نہ تھے جب تم تو لا محدود تھی تاریکیٔ فرقت
تمھارے ساتھ ہی آتے ہوئے دیکھی سحر میں نے

قیامت تک نہ ہوگی ختم میری شرح دل ہمدم
اگر کہنے سے تیرے گو بھی دی کچھ مختصر میں نے

ہائے اس مجبوریٔ ذوق نظر کو کیا کروں
وہ مجھے دیکھیں نہ دیکھیں میں انھیں دیکھا کروں

حسن کے حسن ندامت کا تقاضہ ہے کہ آج
صدق دل سے پھر یقین وعدہ فردا کروں

میں نے مانا ضامن تسکین دل ہے ترک شوق
لیکن اپنے واقعاتِ زندگی کو کیا کروں

زندگی شاہد عزائم پروری کا نام ہے
سوچتا ہوں ہر نفس اب کیا کروں اب کیا کروں

مآل عشق پہلے سے اگر معلوم ہو جائے
جنوں کی لذتوں سے زندگی محروم ہو جائے

بہت دلکش ادائے رقص بسمل ہوتی جاتی ہے
کہیں ایسا ہو ظالم ہی خود مظلوم ہو جائے

شاید حریفِ آرزوئے دل ہے ان کی یاد
جب وہ نہیں تو پیار کے قابل ہے ان کی یاد
رنگینیٔ حیاتِ دو روزہ نہ پوچھیئے
اس مختصر سے وقت میں شامل ہے ان کی یاد
یوں کر رہا ہوں ان کو بھلانے کی کوششیں
جیسے کوئی حجاب مقابل ہے ان کی یاد
ان کے بغیر بھی ہے وہی لطفِ مے کشی
وہ دور ہیں تو ساقیٔ محفل ہے ان کی یاد

جلوۂ حسنِ کرم کا آسرا کرتا ہوں میں
جو خطا ممکن ہے مجھ سے بے خطا کرتا ہوں میں
جب صبوحی لے کے درد مرحبا کرتا ہوں میں
زندگی کو نیند سے چونکا دیا کرتا ہوں میں
ہائے وہ عالم کہ جب ہر شے سے گھبراتا ہے دل
آپ ہی اپنی نگاہوں سے بچا کرتا ہوں میں
وہ بھی کیا دن تھے کہ تھا پینے پلانے ہی سے کام
ہائے اب چار آنسوؤں پر اکتفا کرتا ہوں میں

دلربا ہوتے ہیں جن کے آخری لمحاتِ زیست
اکثر ان پھولوں سے دامن بھر لیا کرتا ہوں میں

دیکھنے والے مری خاموشیِ لب کو نہ دیکھ
آنکھوں آنکھوں میں فسانے کہہ دیا کرتا ہوں میں

مظہرِ حسنِ طلب ہوگی نگاہِ بے طلب
مدعا یہ ہے کہ ترکِ مدعا کرتا ہوں میں

صرف اس دھن میں کہ تعمیرِ محبت سہل ہو
جانے کن کن مشکلوں کا سامنا کرتا ہوں میں

دل لرز جاتا ہے سنکر ہر ستارے کا شکیلؔ
چاند سے تنہائیوں میں کچھ کہا کرتا ہوں میں

سحر سے خوں بداماں آسمان پیر ہے ساقی
زمانے پر مسلط جنگِ عالم گیر ہے ساقی

اسیروں نے جو دیکھا تھا کبھی فصلِ بہاراں میں
مآلِ کشمکش اس خواب کی تعبیر ہے ساقی

بدلتی جا رہی ہے ذہنیت اربابِ دانش کی
ہر اک موجِ نفس چلتی ہوئی شمشیر ہے ساقی

نہ ہو مایوس مستقبل، ابھی کھل جائے گا تجھ پر
زمانے میں ترے رندوں کی کیا توقیر ہے ساقی
قسم اس آتشیں ماحول کی تجھ کو اٹھا ساغر!
کہ ہر تخریب کے پردے میں اک تعمیر ہے ساقی

دھندلی دھندلی فضا نہ صبح نہ شام
ہائے کمبخت زندگی کا نظام
دیدہ و دل ہیں خوگر آلام
تیرے قربان ساقیا اک جام
حسن کی چشم اولیں کی قسم
عشق نے پالیا خود اپنا مقام
قفس مرگ بے اماں کی قسم
زندگی ہے فریب دانہ و دام
آپ نے کس نظر سے دیکھا تھا
دل ابھی تک ہے مورد الزام

ختم شد